ہندوستان کی
کہانیوں کا خزانہ
حصّہ اوّل
CHILDREN'S BOOK TRUST
NEW DELHI

ہندوستان کی
کہانیوں کا خزانہ

حصہ اوّل

مصنف : شنکر

مصوّر : دیو برت مکرجی

مترجم : خسرو متین

چلڈرن بک ٹرسٹ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان بچوں کا ادبی ٹرسٹ

مندرجات

پیش لفظ

ہندوستان ایک ایسی نانی اماں کی طرح ہے جو بہت بزرگ اور سمجھ دار ہے۔ اُسے سینکڑوں کہانیاں آتی ہیں۔ نانی ماں کہتی ہے کہ موٹی موٹی اور بڑی بڑی کتابیں سب کے کام نہیں آتیں مگر ان کتابوں میں جو عقل مندی کی باتیں کہی گئی ہیں وہ کہانیوں کے ذریعہ باآسانی سمجھ میں آجاتی ہیں۔

ایسی کہانیوں کو لوک کتھا یا عوامی کہانی کہتے ہیں۔ یہ کہانیاں اتنی پرانی ہیں کہ کوئی بھی یقین سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ انھیں سب سے پہلے کس نے کہا ہوگا۔ عوامی کہانیاں ایک کان سے دوسرے کان میں، ایک ملک سے دوسرے ملک میں سفر کرتی ہیں۔ ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچنے میں اس کے خدوخال بدل جاتے ہیں۔ ایک ہی کہانی مختلف مقامات پر مختلف انداز سے کہی اور سنی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کہانیاں کبھی نہیں مرتیں۔

ہندوستان میں دنیا کے دیگر ممالک کے مقابلے زیادہ عوامی کہانیاں ملتی ہیں۔ ان میں سے بہت سی کہانیوں کو ایک کتابی شکل میں یکجا کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا نام ہے ''کتھاسَرِت ساگر'' یعنی کہانیوں کی ندی سے بنا سمندر — اور یہ اتنی بڑی کتاب ہے کہ اس کی انّیس جلدیں ہیں۔

ہم شکل

اودھ میں ایک راجہ راج کرتا تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ تینوں تعلیم یافتہ، عقل مند اور ذہین تھے۔

ایک دن راجہ نے اپنے تینوں بیٹوں کا امتحان لینے کے لیے انھیں بُلایا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ کسی ملزم کو سزا دینے کے معاملے میں ان کی کیا رائے ہے۔

''مان لو'' راجہ نے کہا۔ ''اگر میں اپنی زندگی اور عزّت کی حفاظت کی ذمّہ داری کسی شخص کو سونپ دوں اور وہ میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائے تو اس شخص کو کیا سزا ملنی چاہیے؟''

بڑے بیٹے نے کہا۔
" ایسے شخص کا فوراً سر قلم کر دینا چاہیے۔ "
دوسرا بیٹا بولا۔
"میرا بھی یہی خیال ہے۔ ایسے شخص کو سزائے موت ہی ملنی چاہیے۔ اس کے ساتھ کسی قسم کی رحم دلی یا رعایت کرنا جائز نہیں۔" تیسرا بیٹا خاموش رہا۔
" کیا بات ہے میرے بیٹے۔ ؟ "
راجہ نے اس سے پوچھا۔
" تم کچھ نہیں بولے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ ؟ "
"حضور والا!" چھوٹے راجکمار نے کہا۔ "یہ سچ ہے کہ ایسے سنگین جرم کی سزا سوائے موت کے اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ مگر سزا دینے سے قبل یہ بات ثابت ہو جانی چاہیے کہ وہ شخص واقعی قصوروار ہے یا نہیں۔ "

'' یعنی تمہارے خیال میں اگر ایسا نہ کیا گیا تو کوئی معصوم آدمی بھی بے وجہ مارا جا سکتا ہے۔'' راجہ نے پوچھا۔

'' جی ہاں! '' راجکمار نے جواب دیا۔

'' ایسا ممکن ہے۔ مثال کے طور پر میں آپ کو ایک کہانی سناتا ہوں۔'' چند لمحے خاموش رہ کر چھوٹے راجکمار نے کہانی سنانی شروع کی۔

وِدَربھ دیس کے راجہ کے پاس ایک انوکھا طوطا تھا۔ اس طوطے کا م نام تھا ہم شک۔ وہ محل میں پالتو پرندوں کی طرح رہتا تھا۔ ہم شک بہت عقل مند تھا۔ وہ انسانوں کی طرح مختلف زبانوں میں بات کر سکتا تھا۔ راجہ اکثر حکومت کے معاملوں میں ہم شک سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ ہم شک پنجرے میں نہیں رہتا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا۔ ایک دن سویرے وہ محل سے اڑ کر جنگل کی طرف نکل گیا۔ وہاں اتفاق سے اس کی ملاقات اُپنے باپ سے ہو گئی۔

''تم سے مل کر میں بے حد خوش ہوا ہوں۔ ''
اس کے باپ نے کہا۔

'' تمہاری ماں بھی تم سے مل کر بہت خوش ہو گی۔ کیا تم دو چار دن کے لیے گھر نہیں آ سکتے۔ ؟ ''

" گھر آنے کی تو میری بھی بڑی خواہش ہے۔" ہم شک نے جواب دیا۔
" مگر۔۔۔ اس کے لیے مجھے راجہ سے اجازت لینی ہو گی۔ "
محل واپس آ کر ہم شک نے راجہ سے گھر جانے کی اجازت مانگی۔ پہلے تو راجہ اُسے اجازت دینے کے لیے راضی نہیں ہوا۔ وہ ہم شک کو بہت چاہتا تھا اور اسے اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتا تھا مگر ہم شک کے بے حد اصرار پر وہ راضی ہو گیا اور اس نے ہم شک کو گھر جانے کی اجازت دے دی۔
" تم اپنے ماں باپ کے ساتھ گھر پر کچھ دن گزار سکتے ہو۔ لیکن جتنی جلدی ممکن ہو لوٹ آنا۔"
" بہت اچھا مہاراج ! " ہم شک نے خوش ہو کر کہا۔
" میں پندرہ دن بعد لوٹ آؤں گا۔ "
راجہ سے رخصت لے کر ہم شک اپنے باپ کے پاس جنگل پہنچا۔ دونوں ساتھ ساتھ اڑتے ہوئے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اتنے دن بعد اپنے بیٹے کو دیکھ کر ہم شک کی ماں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔
پندرہ دن گزارنے کے بعد ہم شک نے واپسی کے لیے اجازت چاہی۔ " آپ لوگوں کے ساتھ گزارے ہوئے یہ دن میرے لیے بڑے ہی پرمسرت تھے۔ مگر اب مجھے جانا ہو گا۔ راجہ میری راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ "
ہم شک کے ماں باپ اس کے اتنی جلدی جانے کی بات سن کر اُداس ہو گئے۔ مگر وہ اُسے روک نہ سکے کیوں کہ ہم شک نے راجہ سے پندرہ دن بعد واپس لوٹ آنے کا وعدہ کیا تھا۔
" ہم راجہ کے لیے کوئی تحفہ بھجوانا چاہتے ہیں۔" ہم شک کے باپ نے کہا۔ "لیکن ! سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا چیز بھجوائیں ؟ " ماں باپ دونوں ہی دیر تک اس بارے میں سوچتے رہے کہ راجہ کے لائق کیا چیز ہو سکتی ہے۔ آخر ہم شک کے باپ نے خوش ہو کر کہا۔
" آہا ! میں سمجھ گیا۔ راجہ کے لیے اس سے بہتر اور کیا تحفہ ہو سکتا ہے۔ یہاں سے دور ایک پہاڑی پر امر پھل کا پیڑ ہے جو کوئی اس کا پھل کھالیتا ہے۔ وہ کبھی نہیں مرتا اور ہمیشہ جوان رہتا ہے۔ میں وہاں جا کر ایک پھل توڑ لاتا ہوں۔ تم وہ پھل راجہ کو دے دینا۔ "
اتنا کہہ کر ہم شک کا باپ اڑا اور کچھ دیر بعد جادوئی پھل لے کر لوٹ آیا۔ اس نے وہ پھل ہم شک کو دے دیا۔
پھل لے کر جب ہم شک راجہ کے محل کی طرف روانہ ہوا تو شام ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر میں سورج ڈوب گیا اور چاروں طرف رات کا گھنا اندھیرا چھا گیا۔
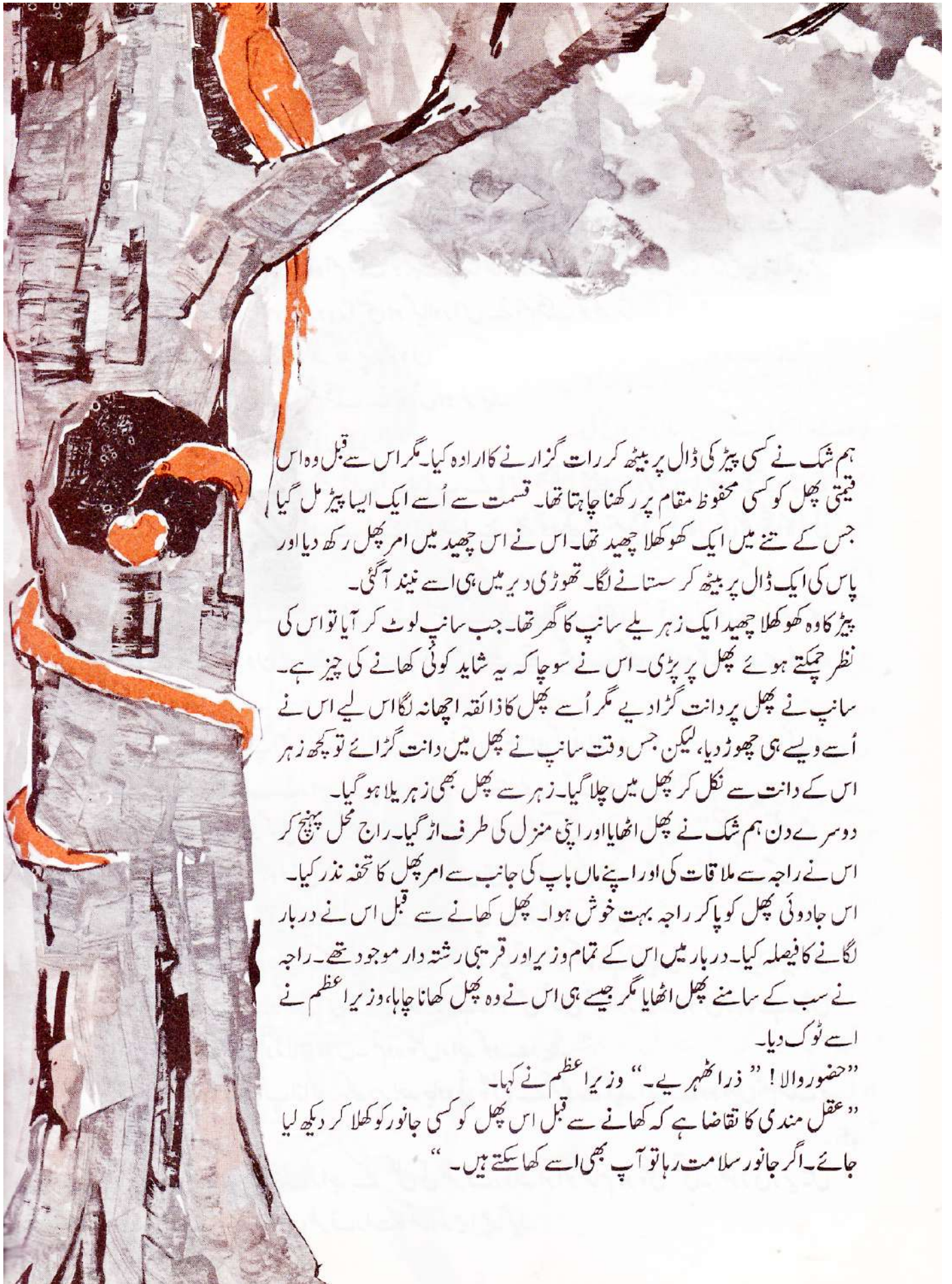
ہم شک نے کسی پیڑ کی ڈال پر بیٹھ کر رات گزارنے کا ارادہ کیا۔ مگر اس سے قبل وہ اس قیمتی پھل کو کسی محفوظ مقام پر رکھنا چاہتا تھا۔ قسمت سے اُسے ایک ایسا پیڑ مل گیا جس کے تنے میں ایک کھوکھلا چھید تھا۔ اس نے اس چھید میں امر پھل رکھ دیا اور پاس کی ایک ڈال پر بیٹھ کر ستانے لگا۔ تھوڑی دیر میں ہی اسے نیند آ گئی۔

پیڑ کا وہ کھوکھلا چھید ایک زہریلے سانپ کا گھر تھا۔ جب سانپ لوٹ کر آیا تو اس کی نظر چمکتے ہوئے پھل پر پڑی۔ اس نے سوچا کہ یہ شاید کوئی کھانے کی چیز ہے۔ سانپ نے پھل پر دانت گڑا دیے مگر اُسے پھل کا ذائقہ اچھا نہ لگا اس لیے اس نے اُسے ویسے ہی چھوڑ دیا، لیکن جس وقت سانپ نے پھل میں دانت گڑائے تو کچھ زہر اس کے دانت سے نکل کر پھل میں چلا گیا۔ زہر سے پھل بھی زہریلا ہو گیا۔

دوسرے دن ہم شک نے پھل اٹھایا اور اپنی منزل کی طرف اڑ گیا۔ راج محل پہنچ کر اس نے راجہ سے ملاقات کی اور اپنے ماں باپ کی جانب سے امر پھل کا تحفہ نذر کیا۔ اس جادوئی پھل کو پاکر راجہ بہت خوش ہوا۔ پھل کھانے سے قبل اس نے دربار لگانے کا فیصلہ کیا۔ دربار میں اس کے تمام وزیر اور قریبی رشتہ دار موجود تھے۔ راجہ نے سب کے سامنے پھل اٹھایا مگر جیسے ہی اس نے وہ پھل کھانا چاہا، وزیر اعظم نے اسے ٹوک دیا۔

''حضور والا! '' ذرا ٹھہریے۔'' وزیر اعظم نے کہا۔

''عقل مندی کا تقاضا ہے کہ کھانے سے قبل اس پھل کو کسی جانور کو کھلا کر دیکھ لیا جائے۔ اگر جانور سلامت رہا تو آپ بھی اسے کھا سکتے ہیں۔''
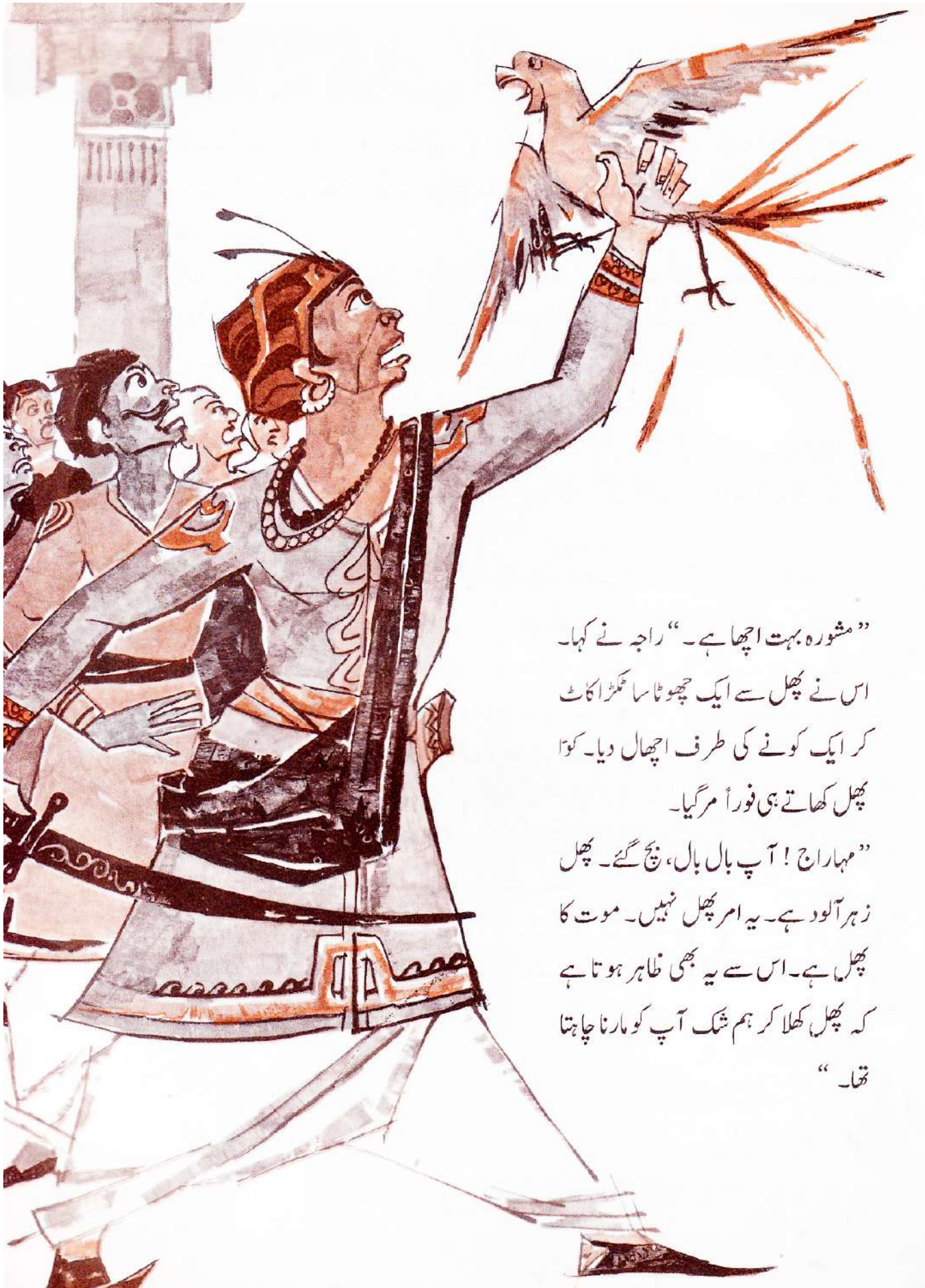
"مشورہ بہت اچھا ہے۔" راجہ نے کہا۔ اس نے پھل سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا کاٹ کر ایک کونے کی طرف اچھال دیا۔ کوّا پھل کھاتے ہی فوراً مر گیا۔

"مہاراج! آپ بال بال، بچ گئے۔ پھل زہرآلود ہے۔ یہ امر پھل نہیں۔ موت کا پھل ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ پھل کھلا کر ہم شک آپ کو مارنا چاہتا تھا۔"

راجا غصّے سے آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے لپک کر ہم شک کو پکڑا اور بغیر سوچے سمجھے اس کی گردن اڑا دی۔ اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ اس زہریلے پھل کو شہر کے باہر ایک گہرے گڑھے میں دبا دیا جائے۔

پھل زمین میں دبا دیا گیا مگر کچھ عرصے بعد ہی اس کا بیج پھوٹ کر دھیرے دھیرے ایک درخت بن گیا۔ کچھ وقت کے بعد اس پیڑ میں خوبصورت، چمکیلے اور سنہرے پھل لد گئے۔

جب راجا نے اس عجیب و غریب پیڑ کے بارے میں سنا تو سارے شہر میں یہ اعلان کرا دیا کہ اس پیڑ کے پھل زہریلے ہیں۔ یہ موت کے پھل ہیں اس لیے کوئی انھیں نہ کھائے۔

راجا کے حکم کے مطابق اس پیڑ کے چاروں طرف ایک کانٹوں کی باڑ لگا دی گئی اور ایک چوکیدار مقرّر کر دیا گیا۔ موت کے پھل کی خبر سے سارے شہر میں سنسنی پھیل گئی۔ لوگ اس پیڑ کے قریب جانے سے بھی ڈرنے لگے۔

انھیں دنوں شہر میں ایک بوڑھا اور اس کی بیوی رہتے تھے۔ وہ بہت غریب تھے۔ کوئی ان کا مددگار نہ تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اپنی زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ بڑھاپے اور کمزوری کے باعث وہ بھیک بھی نہیں مانگ سکتے تھے۔ اکثر فاقوں کی وجہ سے وہ زندگی سے مایوس ہو چکے تھے اور سوچتے تھے اب ان کا جینا بیکار ہے۔ دونوں نے سوچا ایسی زندگی سے مر جانا بہتر ہے۔ مرنے کے لیے سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ موت کے پھل کو کھا لیا جائے۔

ایک رات بوڑھا چپکے سے پیڑ کے پاس گیا اور پہریدار کی نظر بچا کر باڑ کے اندر گھُس گیا۔ اس نے پیڑ سے دو پھل توڑے اور خاموشی سے گھر لوٹ آیا۔ گھر پہنچ کر اس نے اور اس کی بیوی نے ایک ایک پھل کھا لیا اور بستر پر لیٹ کر موت کا انتظار کرنے لگے۔

لیکن دوسرے دن روزانہ کی طرح صبح سویرے پھر ان کی آنکھ کھل گئی۔ اپنے آپ کو زندہ دیکھ کر انھیں بڑا تعجب ہوا۔ اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ دونوں بالکل جوان ہو گئے تھے۔ ان میں پہلے جیسی چستی اور طاقت بھی لوٹ آئی تھی۔

راجا نے یہ انہونی خبر سنی تو وہ خود انھیں دیکھنے گیا۔ دونوں کو واقعی جوان دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اب راجا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ ہم شک جو پھل لایا تھا وہ واقعی امر پھل تھا۔ اُسے اپنی جلد بازی پر، اپنے پیارے طوطے کو بے قصور مارنے پر بے حد افسوس ہو رہا تھا۔

" اس لیے میں کہتا ہوں۔ " چھوٹے راجکمار نے آگے کہا۔

" کہ کسی کو سزا دینے سے پہلے اس بات کا ٹھیک ٹھیک پتا لگا لینا ضروری ہے. کہ وہ سچ مُچ مجرم ہے یا نہیں۔ "

راجا اپنے تیسرے بیٹے کی بات سن کر بہت متاثر ہوا۔ اس نے اُسے اُسی وقت اپنا جانشین مقرر کر دیا۔

پیریم اور کچبا

کیرتی گڑھ کے ٹھاکر کی اکلوتی بیٹی پیریم بڑی ہی خوبصورت تھی۔ اس کی خوبصورتی کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ پیریم بڑی ہی مغرور اور ضدی لڑکی بھی تھی۔
ایک دن وہ محل کے باغ میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ کھیل ہی کھیل میں اس کی ایک سہیلی نے کہا۔

"پیریم ! سنا ہے تمہاری شادی کچبے سے ہونے والی ہے۔ ہونے والی ہے نا ؟ "

اصل بات یہ تھی کہ گجراتی میں کچھوے کو کچبا کہا جاتا ہے۔

اب کون نہیں جانتا کہ کچبا کیسا جانور ہوتا ہے، اس لیے پیریم نے سوچا جس کا نام ہی کچبا ہو، وہ کتنا بد صورت ہوگا۔

"کچبا!" اس نے غصّے سے ناک سکوڑ کر کہا۔

"کیسی بیہودہ بات کرتی ہو۔ ! تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں اُس بدصورت آدمی سے شادی کروں گی ؟"

پیریم جانتی تھی کہ اس کی سہیلی کا مطلب جونا گڑھ کے راجکمار سے تھا۔ اس نے راجکمار کو دیکھا نہیں تھا۔ اس کا اصلی نام ہمیر تھا مگر گھر کے لوگ اسے پیار سے کُبڑا کہہ کر پکارتے تھے۔ پیریم کو یقین تھا وہ بدصورت ہی ہوگا ورنہ اس کا نام کُبڑا کیوں رکھا جاتا۔

پیریم کی سہیلیوں نے کُبڑے کے بارے میں کچھ اور بتانا چاہا مگر اس نے اُن کی بات ان سنی کردی۔ جس کا نام ہی کُبڑا ہو وہ تھوڑا بہت کُبڑے جیسا دکھائی ضرور دیتا ہوگا۔ پیریم نے سوچا اس کی سہیلیاں ہنسی مذاق میں کہہ رہی ہوں گی مگر اس نے اپنے دل میں پکّا ارادہ کرلیا کہ وہ کسی قیمت پر بھی کُبڑا سے شادی نہیں کرے گی۔

"میرے سامنے اس کا ذکر بھی مت کرو۔" اس نے اپنی سہیلیوں سے کہا "میں اس کے بارے میں کچھ بھی سننا نہیں چاہتی۔"

اس کے کچھ دن بعد پیریم کی ماں نے اس کو بلا کر کہا۔

"اب ہم جلد ہی تمہاری شادی کرنے والے ہیں۔ تمہاری شادی کُبڑا سے ہوگی۔"

"نہیں ماں!" پیریم نے کہا۔ "میں کُبڑا کے ساتھ شادی نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ تمہیں شادی کرنی پڑے گی۔ تم جانتی نہیں کہ تمہاری اور اس کی شادی برسوں پہلے طے ہوچکی ہے۔ اب تم انکار نہیں کرسکتیں۔"

" میں نہیں جانتی۔" پیریم نے کہا۔" میں اس کے ساتھ شادی کرنا نہیں چاہتی۔ مہربانی کر کے پتا جی سے کہہ دیں کہ وہ کِپا سے شادی کرنے کے لیے مجھ پر زور نہ ڈالیں۔ "

" تم میری بات تو سنو بیٹی ! " اُس کی ماں نے کہا۔

" اس کے ماں باپ اور ہم نے مل کر ہی یہ شادی طے کی۔

" تب آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں۔ " یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔ پیریم اپنے ماں باپ کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی۔ وہ اُسے افسردہ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس کے باپ نے جونا گڑھ کے راجہ کو یہ پیغام بھجوادیا کہ ان کی بیٹی کِپا سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔ اس لیے منگنی توڑی جارہی ہے۔ یہ اطلاع پاکر جونا گڑھ کا راجا غصّے سے بوکھلا اٹھا۔ اُس نے اپنے جاسوسوں کے ذریعہ پتا لگایا کہ پیریم کِپا سے صرف اس لیے شادی کرنے سے انکار کر رہی ہے کہ اُسے کِپا نام پسند نہیں۔ جونا گڑھ کا راجا پیریم سے بھی زیادہ ضدی تھا۔ اس نے سوچا کوئی ایسا راستہ ڈھونڈھا جائے جس کے ذریعہ کِپا کی شادی پیریم کے ساتھ ہی ہو سکے۔

" میں دیکھوں گا ۔" اس نے قسم کھاتے ہوئے کہا۔

" اس گھمنڈی لڑکی کو میرے ہی لڑکے کے ساتھ شادی کرنا پڑے گی۔ "

اس واقعہ کے کچھ دن بعد راجا نے راجکمار کی شادی کی تیاریاں شروع کردیں۔ دور اور قریب تمام ملکوں کے راجاؤں کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ جونا گڈھ کے راجکمار کی شادی ہونے والی ہے۔ سب اس میں شرکت کریں۔ کچھ دن بعد شہر سے راجکمار کی شاندار برات کیرتی گڈھ کی راجدھانی سورٹھ کی طرف چل دی۔ تری اور نقاروں کی کان پھاڑ دینے والی آوازوں کے ساتھ برات شہر میں داخل ہوئی۔ شہر کے تمام لوگ اپنا کام کاج چھوڑ کر برات دیکھنے سڑکوں پر نکل آئے۔ انھوں نے ایسی شاندار برات پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس وقت پیریم اپنی سہیلیوں کے ساتھ باغیچے میں تھی۔ ان میں سے کسی کو بھی اس شاندار برات کے بارے میں علم نہیں تھا۔ اُسی وقت ایک سہیلی دوڑتی ہوئی آئی اور بولی۔

" راجکماری پیریم ! تم نے یہ خبر نہیں سُنی۔ "

" نہیں۔ !" راجکماری نے کہا۔ " کونسی خبر ؟ "

" تم نے کِپا سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا نا۔ اس کے باپ نے دوسری جگہ اس کی شادی طے کر دی ہے۔ "

"تو کیا ہوا؟" پیریم نے کہا۔ "جو کرتے ہیں، کرنے دو۔"

"چلو کم سے کم برات تو دیکھ لیں۔" دوسری سہیلیاں بولیں۔

"بڑا مزہ آئے گا۔"

برات دیکھنے کے لیے پیریم راضی ہو گئی۔ اس بدصورت کچھے سے خود تو اُسے شادی کرنی تھی نہیں۔ اس لیے اس نے سوچا ایک نظر دیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ محل کے جھروکے میں آ بیٹھی۔ اُسی وقت برات محل کے جھروکے کے نیچے سے گزر رہی تھی۔ برات کے آگے سجے ہوئے سفید گھوڑے

پر ایک لمبا خوبصورت نوجوان سوار تھا۔ اس کا لباس بڑا ہی خوبصورت اور قیمتی تھا۔ تمام لوگ اسی نوجوان کو دیکھ رہے تھے۔

"کتنا خوبصورت ہے۔" لوگ کہہ رہے تھے۔

"بالکل دیوتا جیسا دکھائی دیتا ہے۔"

"کپا کہاں ہے۔؟" راجکماری پیریم نے پوچھا۔

"وہ ہے۔" اس کی سہیلیوں نے جواب دیا۔"

"وہ سفید گھوڑے پر سوار اکپا ہی تو ہے۔"

پیریم کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

"وہ کپا نہیں ہو سکتا۔" اُس نے اپنے آپ سے کہا۔

" اس میں تو کچھ جیسی کوئی بات نہیں۔ یہ تو بہت خوبصورت ہے۔ اتنا خوبصورت آدمی تو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔"

اب پیریم پریشان ہو گئی۔ اُسے اپنی منگنی توڑنے پر پچھتاوا ہونے لگا۔

'ہے بھگوان !' اس نے سوچا۔ 'میں نے اتنے خوبصورت اور بھلے آدمی کی بے عزتی کی۔ اب کیا ہو۔؟ کیسے اپنی غلطی کی معافی مانگوں۔؟

اس نے فوراً فیصلہ کیا کہ وہ خود راجکمار کے پاس جا کر اپنی غلطی کی مافی مانگے گی۔

پیریم جھروکے سے نکل کر دوڑتی ہوئی سڑک پر جا پہنچی۔ ضدی اور مغرور راجکماری کو یوں سڑک پر بے اختیار دوڑتے دیکھ کر لوگ حیران

ہو گئے۔ لوگوں نے اس کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ وہ راجکمار کو پکارتی اس کے گھوڑے کی جانب تیزی سے بڑھنے لگی۔

"تم کون ہو۔ ؟" پیریم کے قریب آنے پر راجکمار کچپے نے پوچھا۔

"میں پیریم ہوں کیرتی گڈھ کے ٹھاکر کی لڑکی۔ "راجکماری نے کہا۔

"اوہو ! تو پیریم آپ ہیں۔ مہربانی کر کے ذرا ایک طرف ہو جایئے۔ ورنہ گھوڑے سے ٹکر لگ جائے گی۔ میں شادی کرنے جارہا ہوں۔ اس لیے ذرا جلدی میں ہوں۔"

"شادی کرنے ؟ یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کس سے شادی کرنے جارہے ہیں۔ ؟ آپ کی منگنی تو بچپن میں میرے ساتھ ہوئی تھی۔ میں ہی آپ کی دلہن ہوں۔"

"غلط۔ بالکل غلط۔ وہ منگنی تو ٹوٹ چکی ہے۔ اوریاد ہے آپ ہی نے توڑی تھی۔" کچپا نے مسکرا کر راجکماری کو چڑاتے ہوئے کہا۔

"وہ میری بھول تھی۔ بھاری بھول۔" پیریم نے کہا۔

"میں نے منگنی اس لیے توڑی تھی۔ کہ — کہ — میں نے ۔"

اس کے آگے وہ کچھ نہ بول سکی۔ اس کا گلا رندھ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"میں جانتا ہوں۔ جانتا ہوں۔" کچپا نے کہا۔

"تم میرے نام کی وجہ سے مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن بھلا نام سے کیا ہوتا ہے۔؟"

اسے پیریم کو چڑانے میں مزہ آرہا تھا۔ مگر دل ہی دل میں وہ خوش تھا کہ راجکماری نے اپنی غلطی مان لی ہے۔

"مگر۔ دیکھئے نا۔ "پیریم نے روتے روتے کہا۔

"نام سے بھی ہوتا ہے۔ بہت کچھ ہوتا ہے۔ کچپا نام سن کر ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بڑا کالا کالا بدصورت جانور ہو۔ مگر ہمیر کتنا اچھا لگتا ہے۔ ہم — میر — ہم — میر۔ کتنا پیارا نام ہے۔ ؟"

اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر گالوں کو تر کر رہے تھے۔ جوناگڈھ کے راجہ دور کھڑے یہ تمام منظر دیکھ رہے تھے۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ نادان اور ضدی لڑکی اب راہ پر آگئی ہے۔ وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اب پیریم کو راجکمار کچپا سے شادی کرنے میں کوئی شرم نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد وہ شاندار برات ٹھاکر کے محل کی طرف چل دی۔ ٹھاکر اور اس کے لوگوں نے برات کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ پیریم اور راجکمار کچپا کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی گئی۔ شادی کی خوشی میں سورت اور جوناگڈھ دونوں شہروں میں کئی دن تک جشن منایا جاتا رہا۔

بلّو شاہ، شاہِ کنجوس

بلو شاہ گجرات کا رہنے والا تھا۔ وہ بڑا ہی کنجوس مکھی چوس تھا۔ پیسہ خرچ کرنے میں اس کی نانی مرتی تھی۔ دوسروں کا تو ذکر ہی کیا اُسے تو خود اپنی ذات پر پیسہ خرچ کرنا پسند نہیں تھا۔

ایک دن کی بات ہے کہ ایک اونچے کھجور کے درخت پر کھجور لگے دیکھ کر بلّو شاہ کا دل مچل اٹھا۔ مگر سوال یہ تھا کہ اتنے اونچے درخت سے کھجور کیسے توڑی جائے۔ اگر کسی دوسرے سے تڑوائی جائے تو مزدوری مانگے گا اور اتنے چھوٹے کام کی مزدوری دینا بلّو شاہ کو منظور نہیں تھا۔ آخر کار اس نے خود ہی پیڑ پر چڑھنے کا فیصلہ کیا۔

اس سے پہلے بلّو شاہ کبھی کھجور کے درخت پر نہیں چڑھا تھا۔ جیسے تیسے کر کے وہ کھجور کی چوٹی تک پہنچ ہی گیا۔ وہ کھجور توڑنے والا ہی تھا کہ اس کی نگاہ اچانک
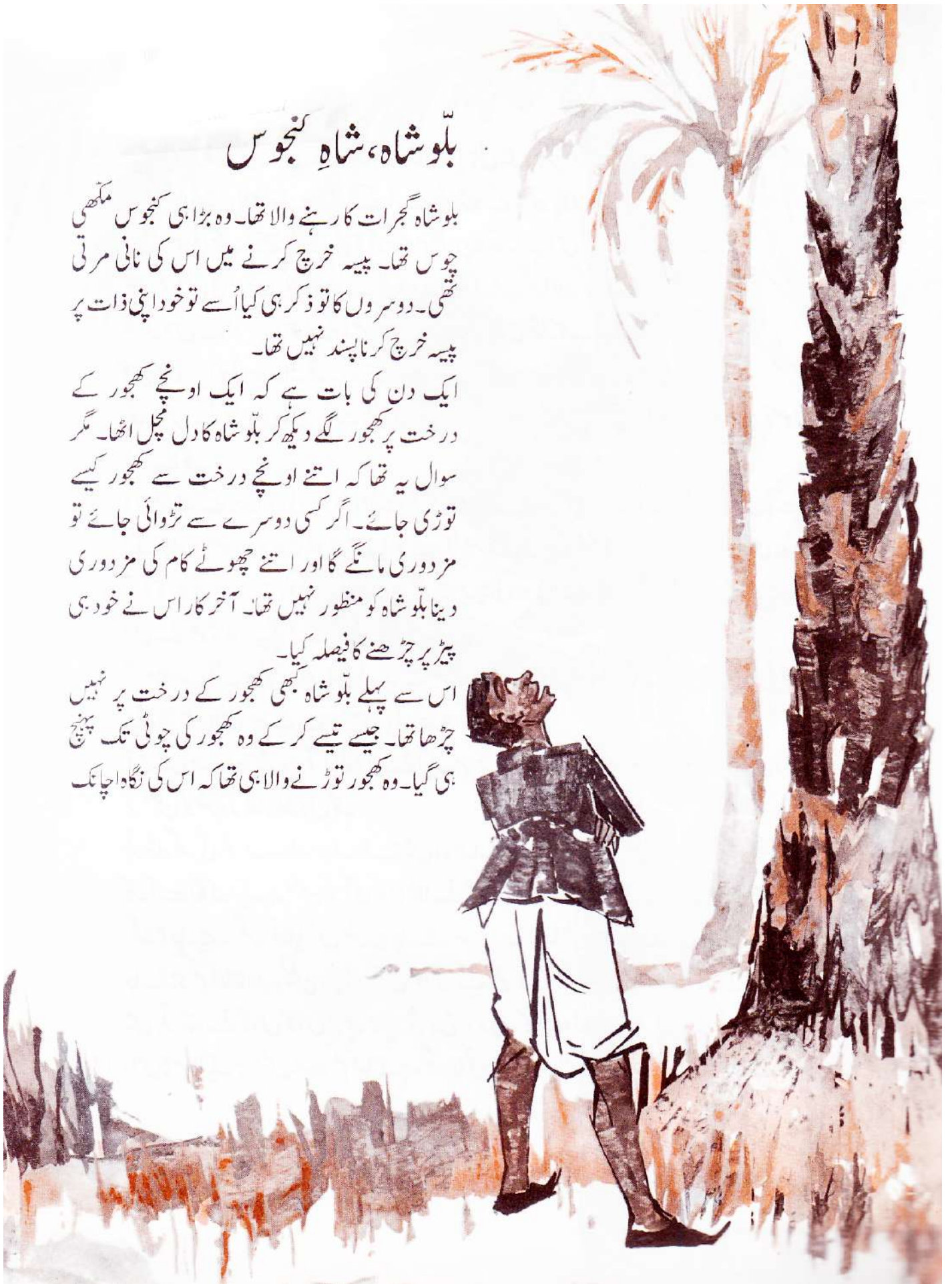
نیچے کی طرف گئی۔ اس نے دیکھا کہ زمین تو پاتال میں نظر آ رہی ہے اور وہ خود آسمان میں لٹکا ہوا ہے۔ ڈر کے مارے بلّو شاہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس اونچائی تک پہنچتے پہنچتے اس کا آدھا دم نکل چکا تھا۔ اب اس نئی مصیبت کو دیکھ کر اس کی گرفت کمزور ہونے لگی۔ اُسے لگا کہ اب گرا اور گرتے ہی فوراً مرا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا مگر آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اب خدا کے سوا اس کا دوسرا کوئی سہارا نہ تھا۔ اگر خدا اُسے بچائے تو وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ اس نے دل ہی میں منّت مانی کہ اگر وہ صحیح سلامت نیچے پہنچ گیا تو ایک ہزار برہمنوں کو کھانا کھلائے گا۔

اس منت کے بعد اس کی تھوری ہمّت بڑھی۔ وہ کچھ نیچے اُتر آیا۔ اب اُسے لگا کہ اتنی سی بات کے لیے ایک ہزار برہمنوں کو کھانا کھلانا کچھ زیادہ ہے۔ اگر صرف پانچ سو کو کھلایا جائے تو بھی خدا راضی ہو جائے گا۔ " اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کو کھلانے میں جو پریشانی ہو گی اُسے خدا اچھی طرح سمجھتا ہے۔ " اس نے تھوڑا اور نیچے آنے پر دل ہی دل میں کہا۔

" مناسب تو یہ ہو گا کہ اگر پانچ کی بجائے صرف دو سو لوگوں کو کھلایا جائے۔ " اس طرح جیسے جیسے وہ نیچے اترتا گیا اسی نسبت سے برہمنوں کی تعداد گھٹاتا گیا۔

آخر میں جب وہ زمیں پر آ گیا تو اس نے ایک مرتبہ بڑی سنجیدگی سے منّت مانی کہ خدا کی راہ میں ایک برہمن کو ضرور کھانا کھلاؤں گا۔

بلّو شاہ گھر کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں وہ حساب لگانے لگا کہ برہمن کو کھلانے میں کتنا خرچ آئے گا۔ اُسے لگا کہ ایک برہمن کو بھی کھانا کھلانے میں کم خرچ نہیں ہوتا ہے۔ کسی طرح اس خرچ کو بھی گھٹانا چاہیے۔ مگر گھٹایا کس طرح جائے۔ سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ کسی ایسے برہمن کو بلایا جائے جو کم کھاتا ہو۔ لیکن، ایسا برہمن تلاش کیے بغیر ملنا مشکل تھا۔ کم کھانے والے برہمن کی تلاش میں بلّو شاہ نے گاؤں گاؤں پوچھ تاچھ شروع کر دی۔ کافی دوڑ دھوپ کے بعد اُسے پتہ چلا کہ جانکی داس نام کا ایک برہمن بہت کم کھاتا ہے، مگر جانکی داس بڑا چالاک اور گھاگ تھا۔ اس نے بلّو شاہ کے

بارے میں سب کچھ سُن رکھا تھا۔ جب بلّو شاہ نے اُسے کھانے کی دعوت دی تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔
گھر جاکر بلّو شاہ نے اپنی بیوی کو اپنی منّت کی بات بتائی۔ ساتھ ہی یہ بھی بتادیا کہ وہ برہمن کو کھانے کی دعوت دے آیا ہے۔ وہ برہمن دوسرے دن کھانے پر آنے والا ہے۔

" شاملی !" اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

" بھگوان کو خوش کرنے کے لیے ایک برہمن کو کھانا کھلانا ہی پڑے گا۔
کھلانے پلانے کا سارا انتظام تمہارے ذمّے ہے، مگر اس بات کا دھیان رہے، زیادہ خرچ نہ ہو۔

اگلے دن پینٹھ کا دن تھا۔ برہمن کو کھانا کھلانے میں جو گھاٹا ہونے والا تھا اس کو پورا کرنے کے لیے بلّو شاہ کو پینٹھ میں جاکر وہ نقصان پورا کرنا تھا، جو اُسے برہمن کو کھانا کھلا کر ہونے والا تھا۔ اس نے برہمن کی میز بانی کی پوری ذمہ داری اپنی بیوی پر چھوڑ دی۔

" ویسے تو مجھے خود اپنے مہمان کی خدمت کرنی چاہیے۔" اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ " مگر کچھ ضروری کام ہیں اس لیے تم کو ہی سب کچھ کرنا پڑے گا۔"

اس دن جانکی داس نے صبح سویرے ہی بلّو شاہ کو پینٹھ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ موقعہ غنیمت جان کر وہ فوراً بلّو شاہ کے گھر پہنچ گیا۔ دراصل وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کی دعوت کا کس حد تک اہتمام ہو رہا ہے۔ شاملی اپنے مہمان کو اتنے سویرے دیکھ کر الجھن میں پڑ گئی۔ اس نے جانکی داس کو سلام کیا اور اسے عزّت سے گھر میں بٹھا دیا۔

" میں ذرا مندر میں درشن کرنے جارہا تھا۔" جانکی داس نے کہا۔ "راستے میں میں نے بلّو شاہ کو دیکھا۔ وہ بہت جلدی میں تھا۔ میں نے سوچا کہ تمہیں شاید کچھ مدد یا صلاح کی ضرورت ہو۔ سو میں حاضر ہو گیا۔"

" آپ کی بڑی کرپا ہے۔" شاملی نے کہا۔

" آپ کے بھوجن کی تیاری مناسب ریتوں اور رسموں کے ساتھ ہو رہی ہے۔ اگر آپ کوئی اور مشورہ دیں تو میں اسی کے مطابق کروں۔"

" یہ تو معمولی بات ہے۔" جانکی داس نے کہا۔

" لیکن ایک ضروری بات کا دھیان رکھنا ہو گا۔ وچن تو صرف ایک برہمن کے کھلانے کا ہے، مگر تمہیں

دس بارہ آدمیوں کے کھانے کا انتظام کرنا ہو گا۔ مجھے یقین ہے جو کچھ پکایا جانا ہے وہ تمہیں معلوم ہو گا۔ "

شاملی نے ان تمام چیزوں کے نام بتائے جو وہ پکانے والی تھی۔ "بالکل ٹھیک۔ " جانکی داس نے کہا۔ " مگر سب پریشانیوں کو دور کرنے والے گنیش جی کو خوش کرنے کے لیے تین قسم کی مٹھائیاں اور رکھ دی جائیں تو کوئی حرج نہیں ہو گا۔ دیکھو نا! جب خوش کرنا ہی ہے تو سبھی دیوتاؤں

کو کیوں نہ خوش کیا جائے۔"

اتنا کہہ کر جانکی داس چلا گیا۔

شالی نے دوپہر تک تمام چیزوں کو تیار کر لیا۔ تھوڑی دیر میں برہمن بھی آ گیا۔

"کھانا تو تیار ہو ہی گیا ہو گا۔" جانکی داس نے کہا۔

"سب سے پہلے ہم دیوتاؤں کو خوش کریں گے۔"

شالی نے ایک دیا جلایا اور سارا کھانا برہمن کے سامنے رکھ دیا۔ تب جانکی داس نے کہا۔ "تم بڑی ہوشیار عورت جان پڑتی ہو۔ تمہارا بھوجن پروسنے کا ڈھنگ صحیح اور شاستروں کے مطابق ہے لیکن بھینٹ کی چیزوں میں سونے کی دو مہریں بھی شامل ہونی چاہیے تھیں۔ اب تم دیکھ لو مہروں کا ہونا بہت ضروری ہے۔"

شالی کو یاد آیا مہروں کے بارے میں اس کے شوہر نے کوئی بات نہیں کہی تھی، لیکن ضروری رسم ہے تو مہروں کو رکھنا ہی پڑے گا۔ اب اس مقدس موقعہ پر بحث بھی تو نہیں کی جا سکتی۔

پھر جانکی داس کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ اس نے خوب ڈٹ کر کھایا۔ جب اس کا پیٹ بھر گیا تو بچا ہوا سارا کھانا اس نے اپنی چادر میں باندھ لیا۔ یہ کھانا وہ اپنے گھر والوں کے لیے لے جا رہا تھا۔ دیوتاؤں کی نذر کی گئیں مہریں اس نے اپنی دھوتی کی گرہ میں باندھ لیں اور بولا:

"کھانا بہت عمدہ تھا۔ برہمن خوش ہوا۔ بھگوان تم سے اور بلّو شاہ سے ضرور خوش ہوں گے۔ اب صرف ایک رسم اور باقی رہ گئی ہے۔ وہ ہے دَکشِنا۔"

شالی کچھ نہیں سمجھی۔

تب جانکی داس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "جب کسی برہمن کو بھوجن کرایا جاتا ہے تو وہ تب تک پورا نہیں مانا جاتا جب تک کہ دو سونے کی مہریں اُسے دکشنا میں نہ دی جائیں۔ یہ تو دنیا کی جانی مانی رسم ہے۔ اس کے بنا تو کوئی چارہ نہیں۔ شالی نے جانکی داس کو دو مہریں اور دے دیں۔

پوری طرح مطمئن ہو کر جانکی داس گھر لوٹ آیا۔ گھر آ کر اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ تھوڑی دیر میں بلّو شاہ ہمارے گھر آئے گا۔ اس وقت وہ بہت غصّہ میں ہو گا۔ اس کے آنے پر تمہیں جو کچھ کرنا ہو گا اُسے غور سے سنو۔ اتنا کہہ کر جانکی داس نے اپنی بیوی کو کچھ باتیں سمجھائیں۔ اس کے بعد

وہ اپنے کمرہ میں جاکر سو گیا۔ زیادہ کھانے کی وجہ سے اُسے لیٹتے ہی نیند آ گئی اور وہ زور زور سے خراٹے بھرنے لگا۔

اُدھر بلّو شاہ جب گھر پہنچا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ شاملی نے اُسے برہمن کے کھانے اور دکشنا لے جانے والی بات بتائی۔ بلّو شاہ نے برہمن کی حرکتیں سنیں تو مارے غصّے کے اس کا بُرا حال ہو گیا۔ وہ ایک موٹا سا ڈنڈا لے کر اسی وقت جانکی داس کے گھر کی طرف دوڑ پڑا۔

جانکی داس کی بیوی نے جب بلّو شاہ کو ڈنڈا لے کر آتے ہوئے دیکھا تو وہ چھاتی پیٹ پیٹ کر زور زور سے دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

" ارے کمبخت ! " اس نے چیخ چیخ کر کہا۔ " تو نے میرے پتی کا کیا حال بنا دیا۔ تو نے اُسے زہر کھلا دیا ہے۔ تو نے—ہاں —تو نے— تیرے ہی گھر کا کھانا کھا کر ان کا یہ حال ہوا ہے۔ اگر میرے پتی مر گئے تو تو بھی بچ نہیں پائے گا۔ پولس آئے گی اور تجھے پکڑ کر پھانسی چڑھا دے گی۔ ہے بھگوان ! اگر میرے پتی مر گئے تو میرے بچوں کا کیا ہو گا۔؟"

" ذرا دھیرے بولو۔ " بلّو شاہ نے گڑ گڑاتے ہوئے کہا۔
" کہیں لوگ سن لیں گے۔ تم ڈاکٹر کو کیوں نہیں بلاتیں۔ ؟ "
" ڈاکٹر۔ ؟ " برہمن کی بیوی نے گلا پھاڑ کر پوچھا۔
" اس کی فیس کا کیا ہوگا۔ ؟ " ہمارے پاس ڈاکٹر کو دینے کے لیے پیسہ کہاں ہے۔ ؟ فوراً دس سونے کی مہریں دو۔ میں ابھی ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔ اگر ان کا علاج کرانے کے لیے ڈاکٹر نہیں ملا تو تجھے ضرور پھانسی ہوگی۔ "
" تم مجھے ذرا گھر جانے کا وقت تو دو۔ " بلّو شاہ نے ویسے ہی گڑ گڑا کر کہا۔
" بھگوان کی خاطر۔ تھوڑا سا وقت دے دو۔ تم میرے ساتھ کسی کو بھیج دو۔ میں اُسی

کے ہاتھ دس مہریں بھجوادوں گا۔ تم شہر کے سب سے اچھے ڈاکٹر سے علاج کروانا۔ سب سے اچھے ڈاکٹر سے۔"

تب جانکی داس بلّو شاہ کے لڑکے کو اپنی ساتھ لے کر تیزی سے گھر کی طرف بھاگا۔ اُسے دیکھتے ہی اس کی بیوی نے پوچھا۔

"اتنی ہڑبڑی میں کیوں ہو۔ ؟کیاہوا۔ ؟"

"ارے بھگوان!۔" بلّوشاہ نے کہا۔

"ستیاناس ہو گیا۔ تو نے جانکی داس کو زہر کھلایا اور پھانسی مجھے ہونے والی ہے۔"

بلّو شاہ نے جھٹ پٹ اپنی تجوری کھولی۔ دس سونے کی مہریں نکالیں اور جانکی داس کے لڑکے کو دے کر بولا۔

"لے مہریں لے کر فوراً دوڑ جااور اپنی ماں سے کہنا کہ جلدی سے کسی اچھے ڈاکٹر کو بلا لیں۔

لڑکا مہریں لے کر چل دیا۔ اس کے جاتے ہی بلّوشاہ کو بھگوان کی یاد آئی۔

"ہے بھگوان !پھانسی کے پھندے سے بچالو۔ ایک ہزار ایک برہمن کو کھانا کھلاؤں گا۔ پورے ایک ہزار ایک۔"

چاندی کی ٹوکری

راجہ چتردیو کا محل نربدا ندی کے کنارے بنا ہوا تھا۔ محل میں بہت سے نوکر چاکر تھے۔ انھیں میں گووند بھی تھا۔ ایک سویرے کی بات ہے۔ راجکماری نندنی محل کے باغیچے میں پھول توڑنے گئی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ گووند بھی تھا۔ نندنی کے ہاتھوں میں چاندی کی ٹوکری تھی۔ وہ مختلف قسم کے پھول توڑ توڑ کر ٹوکری میں ڈالتی جاتی تھی۔ جب ٹوکری بھر گئی تو وہ محل کی طرف چل دی۔

واپس جاتے وقت انھیں ایک لمبی سی سفید داڑھی والا بوڑھا دکھائی دیا۔ اس کے بالوں کی جٹائیں بنی ہوئی تھیں اور اس نے جوٹ کا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ محل کے باہر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے چاروں طرف کئی لوگ جمع تھے۔ بوڑھا ان سے باتیں کر رہا تھا۔

"گووند ! یہ بوڑھا کون ہے۔ ؟ " نندنی نے پوچھا۔

"اور وہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے۔ ؟ "

" میں ابھی پتا کر کے آتا ہوں۔" گووند نے کہا۔

" تب تک آپ یہیں ٹھہریئے۔ " اتنا کہہ کر گووند بوڑھے کی جانب چل دیا۔ کچھ ہی منٹوں میں وہ لوٹ آیا اور نندنی سے بولا۔

" بوڑھا جیوتشی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کسی کو بھی یہ بتا سکتا ہوں کہ اس کی شادی کس کے ساتھ ہوگی۔ "

" سچ ! "راجکماری نے حیران ہو کر پوچھا۔

" کیسی انوکھی بات ہے، مگر بتاتا کیسے ہے۔ ؟"

"وہ گھاس کے دو تنکے لے کر انھیں آپس میں باندھ دیتا ہے۔ "گووند نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "اور پھر کہتا ہے کہ یہ شادی کا مقدس بندھن ہے۔ "

" تم پھر بوڑھے کے پاس جاؤ اور یہ پوچھ کر آؤ کہ ہماری شادی کس سے ہوگی۔ ؟ "

" راجکماری۔ !" گووند نے کہا۔ " ایسا کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس قسم کے جیوتشی لوگوں کو خوش کرنے کے لیے جھوٹ موٹ کی باتیں کرتے ہیں۔ یہ ان کا روزی کمانے کا طریقہ ہے۔ ایسے لوگوں سے بچ کر رہنے میں ہی بھلائی ہے۔"

" ہم نے تمھاری رائے نہیں پوچھی۔" راجکماری نے تنک کر کہا۔

" فوراً جاؤ اور جو ہم کہہ رہے ہیں پوچھ کر آؤ۔ "

" اچھی بات ہے راجکماری۔ " گووند نے کہا۔

" اگر آپ کا یہی حکم ہے تو میں جاکر پوچھ آتا ہوں۔" گووند ایک مرتبہ پھر بوڑھے کے پاس گیا۔
راجکماری وہیں کھڑی اس کا انتظار کرتی رہی۔
" میں راج محل سے آیا ہوں۔ " گووند نے بوڑھے جیوتشی کے پاس جاکر اس کے کان میں پھُسپھُسا کر کہا۔ "میں تم سے اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ ہماری بات کوئی نہ سن سکے۔ "
بوڑھا لوگوں کے درمیان سے اٹھ کر گووند کے ساتھ ایک کونے میں چلا گیا۔
" بولو کیا پوچھنا چاہتے ہو۔ ؟" بوڑھے نے گووند سے کہا۔
" راجکماری نندنی یہ جاننا چاہتی ہیں کہ ان کی شادی کس کے ساتھ ہوگی۔ ؟"
بوڑھے نے گھاس کے دو تنکے اٹھائے اور انھیں باندھ کر گانٹھ بنائی۔ کچھ دیر تک وہ بڑے غور سے گانٹھ کو دیکھتا رہا۔ پھر گووند کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔
" راجکماری نندنی کی شادی تم سے ہوگی۔ "
" مجھ سے !" گووند بھونچکا ہو کر بولا۔ "میں تو ان کا نوکر ہوں۔ صرف نوکر۔ تمہاری بات غلط ہے۔ بالکل غلط۔ "
" میری بات غلط ہو ہی نہیں سکتی۔" بوڑھے نے کہا۔
" تم ہی اس کے ہونے والے پتی ہو۔"
گووند دھیرے دھیرے بھاری قدموں سے محل کی طرف چل دیا۔
" کیا ہوا ؟ " نندنی نے اسے دیکھتے ہی اشتیاق سے پوچھا۔ "جیوتشی نے کیا کہا۔ ؟ "
" راجکماری " گووند نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ ایسے جیوتشی کبھی سچ نہیں بولتے۔ اس جیوتشی نے ایسی بُری بات بتائی ہے کہ میں اُسے زبان پر بھی نہیں لا سکتا۔"
" یہ میرا حکم ہے۔ جو بوڑھے نے کہا ہے تمہیں بتانا ہوگا۔ "
" اچھی بات ہے۔ " گووند نے جواب دیا " اگر آپ کا حکم ہے تو مجھے ماننا ہی پڑے گا۔ "
" ہاں ماننا پڑے گا۔ " نندنی نے کہا۔
"جیوتشی نے کہا ہے کہ آپ کی شادی مجھ سے ہوگی۔" گووند نے جواب دیا۔
" کیا بدتمیزی ہے۔ ؟ " نندنی اس پر برس پڑی۔

" مجھ سے ایسی بات کہنے کی تمہاری ہمت کیسے ہوئی۔ ؟ "
غصّے کے مارے نندنی اپنے ہوش کھو بیٹھی۔ اس نے پھولوں سے بھری چاندی کی ٹوکری گووند کے سر پر دے ماری اور منہ پھیر کر پیر پٹختی ہوئی محل کی طرف چلی گئی۔
چاندی کی ٹوکری گووند کے ماتھے سے ٹکرائی۔ اس کے ماتھے پر زخم ہو گیا اور خون بہنے لگا۔
راجکماری کی اس حرکت پر اسے بھی غصہ آ گیا۔
" آپ راجکماری ہوں گی تو ہوں گی۔ " تیزی سے جاتی ہوئی راجکماری کی طرف دیکھ کر اس

نے کہا۔ "لیکن آپ کو میری بے عزتی کرنے کا کوئی حق نہیں۔"
نندنی کے توڑے ہوئے پھول گھاس پر چاروں طرف بکھر گئے تھے۔ چاندی کی ٹوکری ایک طرف لڑھکی ہوئی تھی۔ گووند نے جھک کر ٹوکری اٹھائی اور پھاٹک سے باہر نکل گیا۔

"اب دوبارہ اس کا منہ نہیں دیکھوں گا۔" اس نے گھر جاتے ہوئے دل ہی دل میں سوچا۔ گووند نے طے کر لیا کہ اب وہ راجکماری کی نوکری نہیں کرے گا بلکہ کہیں دور چلا جائے گا اور دوسری ملازمت تلاش کرے گا۔

دوسرے دن صبح سویرے اس نے اپنا سامان باندھا اور لمبے سفر پر روانہ ہو گیا۔ ماتھے پر چوٹ کی وجہ سے اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ کئی دنوں تک پیدل چلتا رہا۔ چلتے چلتے ایک بڑے شہر میں پہنچا۔ اس شہر کے لوگ کوئی خوشی کا تہوار منا رہے تھے۔ سب رنگ برنگے اور خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے خوش نظر آ رہے تھے۔

"یہاں تو بڑی چہل پہل دکھائی دے رہی ہے۔" گووند نے ایک لڑکے سے کہا۔

"یہ سب کس خوشی میں ہو رہا ہے۔ ؟"

"تمہیں پتا نہیں۔ ؟" لڑکے نے جواب دیا۔ "آج ہمارے نئے راجا کا چناؤ ہو گا۔"

لڑکے کا جواب سن کر گووند نے اس بارے میں سب کچھ جاننے کی خواہش ظاہر کی۔

"اس دیش کے راجہ کا ابھی حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔" لڑکے نے اُسے بتایا۔

"مرنے سے پہلے وہ حکم دے گئے تھے کہ اگلے راجہ کا انتخاب ایک ہاتھی کرے گا۔ وہ ہاتھی نئے راجہ کو منتخب کرنے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اتنے راجکمار اور سردار شہر میں آئے ہوئے ہیں۔ آؤ ہم بھی چلیں۔ خوب تماشہ رہے گا۔"

گووند بھی اس لڑکے کے ساتھ اس مقام پر گیا جہاں ہاتھی کے ذریعہ راجا کا انتخاب ہونے والا تھا۔ ہزاروں لوگ جمع تھے اور ہاتھی کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ ہر شخص اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ ہاتھی اسی کا انتخاب کرے گا۔

تھوڑی دیر میں باجے گاجے اور ڈھول تاشوں کی آوازوں کے ساتھ شاہی ہاتھی کو لایا گیا۔ وہ بڑے بڑے دانتوں والا شاندار ہاتھی اس خاص موقعہ کے لیے اسے خوب سجایا سنوارا گیا تھا۔ ہاتھی کی

سونڈ میں ایک بڑا سا ہار تھا۔ اُسے اچھی طرح دیکھ بھال کر یہ ہار اس خوش نصیب شخص کو پہنانا تھا جسے اس دیش کا اگلا راجہ بننا تھا۔ ہاتھی دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگا۔ اس نے ہر ایک کو غور سے دیکھا مگر کسی کے گلے میں ہار ڈالے بغیر وہ آگے بڑھ گیا۔ اس نے ایک ایک کر کے تمام راجکماروں اور سرداروں کو دیکھا مگر کسی کو بھی راجہ بننے کے لائق نہ سمجھا۔

اب وہ خاص لوگوں کی بھیڑ کو چھوڑ کر اس طرف بڑھا جہاں عام لوگ تماشائی کی حیثیت سے کھڑے تھے۔

"ہاتھی اصلی راجہ کی تلاش کر رہا ہے۔" کسی نے آواز لگائی۔
لوگوں میں سنسنی سی پھیل گئی۔ لوگ زور زور سے آوازیں لگاتے اور ہاتھی کو پچکارتے ہوئے اپنی جانب متوجہ کرنے لگے۔ ہر کوئی ہاتھی کے قریب جانا چاہتا تھا۔ اُسے تھپتھپانا چاہتا تھا، مگر ہاتھی بڑے سکون سے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔
تبھی اچانک گووند ہاتھی کے سامنے آگیا۔ ہاتھی رکا، تھوڑا نزدیک آیا اور غور سے گووند کو دیکھنے

لگا۔ پھر اس نے گووند کے آگے جھک کر اس کے گلے میں ہار پہنا دیا۔
گووند کے گلے میں ہار پڑتے ہی لوگ خوشی سے چلّانے لگے۔ نقاروں اور ڈھول تاشوں کو زور زور سے بجانے لگے۔ ریاست کے منتریوں اور سرداروں نے گووند کے آگے جھک کر اُسے شاہی سلام کیا۔
گووند کے تعجب کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اُسے لگا کہ جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ اُسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے وہ سچ ہے۔
اس کے بعد گووند کو اسی ہاتھی پر بٹھایا گیا جس نے اُس کو چنا تھا۔ پھر ایک شاندار جلوس کی شکل میں اُسے محل کی طرف لے جایا گیا۔ وہاں مختلف قانون اور روایتی طریقوں سے اُسے باقاعدہ راجہ بنایا گیا۔
گووند ایک نیک راجہ بن گیا۔ وہ بہت سمجھ دار، عقل مند اور شریف آدمی تو تھا ہی۔ اس کی رعایا اس کی بہت عزت کرتی اور چاہتی تھی۔ جلد ہی اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔
گووند کو راجہ بنے کافی وقت گزر چکا تھا۔ اب اس کی شادی کی عمر بھی ہو گئی تھی۔ گووند نے مناسب اور لائق دلہن کے لیے مختلف ریاستوں میں اپنے سرداروں کو بھیجا۔
نندنی کے باپ چتر دیو نے بھی گووند راجہ کی شہرت سنی۔ وہ بھی اپنی بیٹی نندنی کے لیے کسی اچھے راجہ کی تلاش میں تھا۔ اس نے سوچا اگر نندنی کے ساتھ گووند کی شادی ہو جائے تو کتنا اچھا رہے۔
اس نے راجہ گووند کے پاس نندنی کا پیغام بھیجا۔ گووند راضی ہو گیا۔
نندنی اور گووند کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ دونوں ملکوں کے عوام نے دولہا دلہن دونوں کو اپنی نیک خواہشات سے نوازا۔
جب گووند نندنی کو لے کر اپنے ملک میں پہنچا تو بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ لوگ اپنی نئی رانی کو پا کر بہت خوش تھے۔
ایک دن نندنی نے گوند سے پوچھا۔
" آپ کے ماتھے پر یہ چوٹ کا نشان کیسا ہے۔؟ اتنا بڑا زخم یقیناً لڑائی کے میدان میں ہی لگا ہو گا۔ آپ نے ضرور کوئی بہادری کا بڑا کام کیا ہو گا۔ ؟ "

"یہ نشان۔ ؟" گووند نے مسکرا کر کہا۔ "یہ شادی کا مقدس نشان ہے۔"
"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔" نندنی نے کہا۔
"صاف صاف بتایئے، نا۔"
"سیدھی سی بات ہے۔" گووند نے کہا۔ "یہ نشان میری خوش قسمتی کی علامت ہے۔" اس نے مجھے راجہ بنوادیا ہے اور اسی نے مجھے تمہارا پتی بھی۔"
"مہاراج !" نندنی نے بیتابی سے پوچھا۔ "پتا نہیں آپ کیا پہیلیاں بجھا رہے ہیں۔ سیدھی

طرح سے بتایئے نا۔ آپ کو یہ چوٹ کہاں لگی۔ ؟ "
" اچھی بات ہے۔" گووند نے کہا۔ " تم ذرا یہاں رکو۔ میں ابھی ساری بات بتائے دیتا ہوں۔ "
اتنا کہہ کر گووند کمرے سے باہر چلا گیا اور تھوڑی دیر میں چاندی کی ٹوکری لے کر واپس آیا۔
" یاد کرو۔ یہ کیا ہے۔؟" گووند نے پوچھا۔
نندنی نے ٹوکری کی طرف دیکھا۔ پہلے تو وہ الجھن میں پڑ گئی پھر اُسے ایک دم سب کچھ یاد آ گیا۔ یہ اسی کی ٹوکری تھی۔ اس نے گووند کی طرف غور سے دیکھا۔
" گووند ! " وہ چونک کر بولی۔ " اب میں سمجھی آپ وہی گووند ہیں۔ یہ ٹوکری میں نے آپ پر پھینکی تھی۔ معاف کر دیجیے۔ مجھے معاف کر دیجیے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ یہ چوٹ میری ہی لگائی ہوئی ہے۔ اس دن میں نے آپ کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا تھا۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔ کر دیں گے نا "
" اس میں معافی کی کیا بات ہے رانی۔ " گووند نے جواب دیا۔
" ٹوکری پھینکنے کے لیے تو مجھے ہی تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ "
" شکریہ اور میرا۔ مگر کیوں۔؟" " کیوں کہ اگر غصہ میں تم یہ ٹوکری میرے نہیں مارتیں تو میں آج بھی تمہارے محل میں ہی ہوتا۔" گووند نے کہا۔ " اور محل میں ہوتا تو کیسے آج راجہ بنتا اور اگر راجہ نہ بنتا تو تم سے کیسے شادی کرتا۔ "
" کیسی انوکھی بات ہے۔ " نندنی نے کہا۔
" آخر کار اس بوڑھے جیوتشی کی بات ٹھیک ہی نکلی۔ "
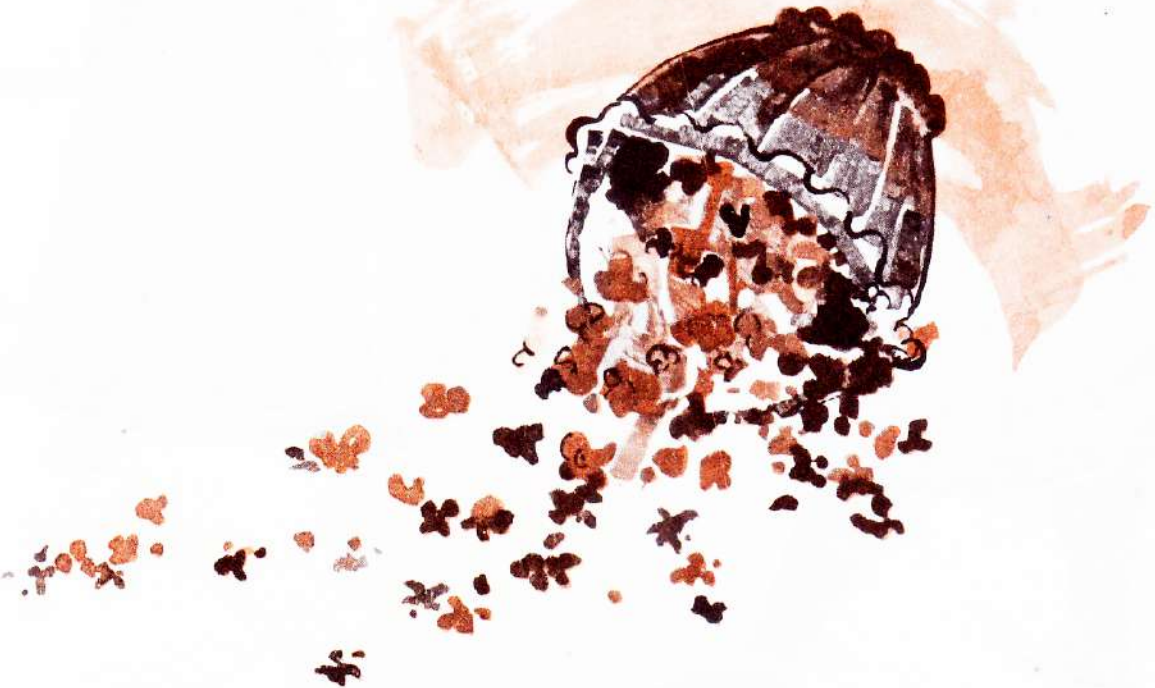
تیجی مالا

کسی زمانے میں آسام کے ایک گاؤں میں ایک سوداگر رہتا تھا۔ وہ بہت امیر تھا۔ اس کے ایک لڑکی تھی۔ لڑکی کا نام تیجی مالا تھا۔ تیجی مالا بہت خوبصورت تھی۔ اس کی ماں نہیں تھی۔ وہ تیجی مالا کو بچپن میں چھوڑ کر مرگئی تھی۔ اس کے باپ نے دوسری شادی کرلی تھی۔ تیجی مالا کی سوتیلی

ماں بڑی ظالم اور بد طینت عورت تھی۔ وہ تیجی مالا سے بے حد جلتی اور اس کے ساتھ ہمیشہ بُرا سلوک کرتی۔ مگر، تیجی مالا بہت نیک اور خوش مزاج لڑکی تھی۔ وہ اپنی سوتیلی ماں کا ادب کرتی اس کا کہنا مانتی۔ گھر میں جھاڑو لگانا، برتن مانجھنا، جنگل سے لکڑی لانا، اور ایسے ہی بیسیوں کام تیجی مالا کو ہی کرنے پڑتے تھے۔ اتنا کچھ کرنے کے باوجود اس کی سوتیلی ماں کبھی خوش نہیں ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ اس کے کاموں میں نقص نکالتی رہتی اور ذرا سی غلطی پر تیجی مالا کی خوب پٹائی کرتی۔

تیجی مالا کا باپ اکثر گھر سے باہر رہتا تھا۔ اسے

اپنے کاروبار کے سلسلے میں لمبے لمبے سفر کرنے پڑتے تھے۔
کچھ دن بعد تیجی مالا ایک ذہین اور خوبصورت جوان لڑکی ہو گئی تو اس کے باپ کو اس کی شادی کی فکر ستانے لگی۔ وہ تیجی مالا کے لیے مناسب رشتے کی تلاش کرنے لگا۔ مختلف جگہوں اور گھرانوں کو دیکھنے کے بعد آخر کار اُسے ایک مناسب لڑکا مل ہی گیا۔ وہ بڑا ہی خوبصورت اور ہونہار لڑکا تھا۔ لیکن شادی سے قبل تیجی مالا کا باپ اس لڑکے کو دنیاداری کا کچھ تجربہ دینا چاہتا وہ اُسے لے کر ایک لمبے سفر پر نکل گیا اور ملکوں، ملکوں، شہروں شہروں سیر کراتا رہا۔
باپ کے جانے کے بعد تیجی مالا اپنی سنگدل سوتیلی ماں کے ساتھ اکیلی رہ گئی اب اس پر کام کا بوجھ دن بدن بڑھنے لگا۔ کپڑوں کے نام پر اُسے صرف چیتھڑے پہننے کو ملتے اور کھانے کے نام پر بچی کچھی جوٹھن۔ اس کے علاوہ جب بھی اس سوتیلی ماں کا دل چاہتا، بے بات ہی اس پر برسنے لگتی اور خوب جی بھر کر پیٹتی۔ اتنا سب کچھ ہونے پر بھی تیجی مالا صبر کا دامن نہ چھوڑتی اور سب کچھ خاموشی سے سہتی رہی۔ اپنی سوتیلی ماں کے خلاف کبھی بھی اس نے کوئی لفظ منہ سے نہ نکالا۔
ایک دن تیجی مالا کی سوتیلی ماں دھان کوٹ رہی تھی۔ اس نے تیجی مالا کو ہاتھ بٹانے کے لیے بلایا۔ تیجی مالا اس کا ہاتھ بٹانے لگی، لیکن جب اس نے دھان کی ڈھیری او کھلی کی طرف سرکانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو سوتیلی ماں نے اس کے ہاتھوں پر موسل مار دیا۔ بیچاری تیجی مالا کے دونوں ہاتھ کچل گئے۔ دوسرے دن ٹھیک اسی طرح اس نے تیجی مالا کے پیر کچل دیئے اور تیسرے دن اس کا سر پھاڑ دیا۔ سر میں زبردست چوٹ سے تیجی مالا مر گئی۔ اس کے مرتے ہی اس بد بخت اور مکّار عورت نے جھوٹ موٹ کے آنسو بہانا اور زور زور سے رونا شروع کر دیا تاکہ پڑوسیوں کو اس بات کا یقین ہو جائے کی تیجی مالا کسی حادثہ میں مر گئی۔ رونا دھونا سن کر پڑوسی دوڑے آئے۔ انھوں نے تیجی مالا کے مرنے پر سوتیلی ماں کو تسلی دی اور قریب کے ایک باغ میں تیجی مالا کی لاش کو دفنا دیا۔
کچھ دن بعد تیجی مالا کی قبر سے ایک بیل اُگ آئی۔ وہ بیل لگاتار بڑھنے لگی۔ وہ کدو کی بیل تھی۔ اس میں بڑے بڑے کئی کدو لگے۔ ایک دن ایک شخص ادھر سے گزرا۔ تازہ تازہ کدو دیکھ کر اس نے انھیں چرانا چاہا۔ مگر، جیسے ہی اس نے ہاتھ بڑھایا ویسے ہی ایک آواز سنائی دی۔
" ٹھہرو ! " آواز نے کہا۔ " مجھے چھو نا مت میں کدو نہیں، تیجی مالا ہوں۔ "

آدمی ڈر کر بھاگ گیا۔ کدو کی بیل سے جو آواز آئی تھی اُسے تیجی مالا کی سوتیلی ماں نے بھی سنا۔ اس نے فوراً اس بیل کو توڑ کر پھینک دیا۔ لیکن جس جگہ کدو کی بیل تھی وہاں پھر ایک مرچ کا پودا اُگ آیا۔ اس میں ہری اور لال لال مرچیں نکل آئیں۔ اس راستے سے گذرتے ہوئے ایک چرواہے نے تازہ تازہ مرچیں دیکھیں تو انھیں توڑنا چاہا۔ مگر جیسے ہی اس نے توڑنا چاہا پھر ویسی ہی آواز سنائی دی۔

" ٹھہرو ! مجھے چھونا مت۔ میں مرچ کا پودا نہیں، تیجی مالا ہوں۔ "

چرواہا سمجھا ضرور کوئی بھوت بول رہا ہے۔ وہ جان بچا کر وہاں سے بھاگا۔

تیجی مالا کی سوتیلی ماں نے مرچ کا وہ پودا بھی اکھاڑ ڈالا اور اس مرتبہ اُسے دور ندی میں پھینک دیا۔ ندی کے بیچ جہاں مرچ کا پودا گرا، ٹھیک وہاں ایک کنول کا خوبصورت پھول کھل اُٹھا۔

اتفاق سے اسی وقت تیجی مالا کا باپ اس نوجوان کو لے کر گھر لوٹ رہے تھے جس سے تیجی مالا کا رشتہ طے ہوا تھا۔ وہ ایک ناؤ میں بیٹھ کر اسی ندی میں سفر کر رہے تھے۔ جب نوجوان نے ندی کے بیچ

ایک خوبصورت کنول کا پھول دیکھا تو اس نے توڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔
"نہیں۔ نہیں۔ مجھے چھونا مت۔" کنول نے کہا۔
"میں کنول نہیں۔ تیجی مالا ہوں۔ مجھے میری سوتیلی ماں نے مار ڈالا ہے۔"
یہ الفاظ سن کر تیجی مالا کا باپ حیران رہ گیا۔
"میں تمہارا باپ ہوں۔" انھوں نے پاگلوں کی طرح چلّا کر کہا۔ "میں ابھی ابھی واپس آیا ہوں۔ میری بیٹی۔ !میری دُلاری تیجی مالا۔ آ۔ میرے پاس آ۔"
اپنے باپ کی محبت بھری آواز سن کر وہ کنول کا خوبصورت پھول تیجی مالا بن گیا۔ تیجی مالا اپنے باپ سے لپٹ گئی اور اپنی دکھ بھری کہانی سنانے لگی۔ پھر وہ تینوں گھر آئے۔ گھر آتے ہی اس کے باپ نے اس ظالم اور بدبخت سوتیلی ماں کو گھر سے باہر نکال دیا۔ تیجی مالا کی شادی ہو گئی وہ اپنے باپ اور شوہر کے ساتھ آرام سے رہنے لگی۔

لکشمی کی گُڑیا

لکشمی کا گھر تنجور کے پاس ایک چھوٹے سے گاؤں میں تھا۔ گھر میں اس کی ساس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ اس کا شوہر روزی روٹی کی تلاش میں دوسرے دیش گیا ہوا تھا اور کئی سالوں سے گھر نہیں آیا۔ شوہر کے جانے کا لکشمی کو بہت دکھ تھا۔ اس کی ساس لکشمی کو بہت چاہتی تھی۔ وہ بڑے پیار اور محبت سے لکشمی کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ لکشمی بھی اپنی ساس کو بے حد چاہتی تھی۔ وہ اپنی ساس کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کرتی تھی۔ یہاں تک کہ روزمرّہ کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں بھی وہ اپنی ساس سے مشورہ لیتی تھی۔

وہ پوچھتی۔ ”کیا میں نہالوں۔ ؟“ یا پھر۔ ” ایک کیلا کھالوں۔ ؟“ یا ”بازار جا کر سبزی ترکاری لے آؤں۔ ؟“

اس کی ساس ہمیشہ ایک ہی جواب دیتی۔ ” ہاں بہو! ہاں۔ “

ایک دن لکشمی کی ساس بیمار پڑ گئی۔ لکشمی نے اس کی چارپائی کے قریب بیٹھ کر اس کی خوب تیمار داری کی۔ مگر بڑھیا کی حالت دن بدن خراب ہوتی گئی۔ لکشمی جان گئی کہ اب اس کی ساس بچ نہیں سکے گی۔

وہ بڑھیا ساس سے لپٹ کر رونے لگی۔

"مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جانا۔ تمہارے پیر پکڑتی ہوں۔ مت جانا۔"

لکشمی کو روتا دیکھ کر اس کی ساس کا من دکھ سے بھاری ہو گیا۔ اس نے لکشمی کو اپنے قریب کھینچ لیا اور پیار سے چومنے لگی۔ پھر کچھ دیر بعد بولی۔ "چنتا مت کر بہو۔ ہمّت رکھ۔ میری لاڈلی۔ اگر تو ہمّت سے کام لے گی تو گھر کو آسانی سے سنبھال سکتی ہے۔ فکر نہ کر تیرا پتی جلد ہی لوٹ آئے گا۔ پھر تم دونوں سکھ سے رہنا۔"

"اوہ۔ ماں!" لکشمی نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"تمہارے بغیر میں کیا کروں گی۔؟ کیسے رہوں گی۔؟"

"میں تجھے ایک چیز دیتی ہوں۔" بوڑھی ساس نے کہا۔

" اس سے تیرا کام آسانی سے ہو جائے گا۔ " یہ کہہ کر بوڑھی ساس نے اپنے سرہانے سے ایک گڑیا نکالی۔ یہ لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ اس نے گڑیا لکشمی کو دیتے ہوئے کہا۔

" جب میں نہیں رہوں گی۔ تب اسی کو میری جگہ مان لینا۔ "

کچھ دنوں بعد بوڑھی ساس لکشمی کو روتا بلکتا چھوڑ کر دوسری دُنیا میں چلی گئی، کئی دنوں تک غموں سے نڈھال لکشمی کچھ نہ کر سکی۔ پھر ایک دن اسے گڑیا کا خیال آیا۔ وہ گڑیا نکال کر لائی اور دیر تک اُسے تکتی رہی۔

" اب تمہیں میری ماں ہو۔ " اُس نے کہا۔ " میں جہاں جاؤں گی تم کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ اور جب مجھے ضرورت ہو گی تمہیں سے صلاح مشورہ بھی کروں گی۔ "

گڑیا کے پاس ہونے سے لکشمی کی ہمّت بندھ گئی۔ وہ اکثر گڑیا سے پوچھا کرتی۔ " میں یہ کرلوں،

وہ کرلوں۔" اور پھر گڑیا کی طرف سے آواز بدل کر خود ہی جواب دیتی۔ "ہاں! بہو! کرلے۔"
روز صبح جب وہ نیند سے بیدار ہوتی تو گڑیا سے پوچھتی۔
" امّاں ! میں اُٹھ جاؤں۔ "
گڑیا جواب دیتی۔ "ہاں! بہو! ہاں اُٹھ جا"
دن گذرتے گئے۔ دھیرے دھیرے لکشمی نے گھر کا سارا کام سنبھال لیا۔
وہ ایک سلیقہ مند عورت بن گئی۔ اس کی گڑیا ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی۔ اور جب بھی اُسے کوئی مشکل پیش آتی وہ اس سے مدد لیتی۔
ایک شام گھر میں جلانے کے لیے لکڑی نہیں تھی۔ لکشمی نے گڑیا سے پوچھا " امّاں! میں جنگل جا کر کچھ لکڑیاں بٹور لاؤں۔ "
" ہاں بہو ! ہاں ! ! " گڑیا نے کہا۔ " جا بٹور لا۔ پر دیکھنا کہیں راستہ مت بھول جانا۔ "
لکشمی جنگل کی طرف چل دی۔ وہاں پہنچ کر وہ اِدھر اُدھر سے سوکھے ڈنٹھل اور چھوٹی چھوٹی ٹہنیاں بٹورنے لگی۔ اسی درمیان آسمان پر گہرے کالے کالے بادل چھاگئے۔ بجلی چمکنے لگی۔ بادل

گرجنے اور برسنے لگے۔
لکشمی نے گڑیا سے پوچھا۔ "امّاں! اب میں کیا کروں۔ ؟ کسی پیڑ کے نیچے کھڑی ہو جاؤں کیا۔ ؟"
" ہاں بہو ! ہاں!! جا کھڑی ہو جا۔ "
کسی گھنے اور سایہ دار درخت کی تلاش میں لکشمی اِدھر اُدھر دوڑنے لگی۔ آخر کار اُسے ایک برگد کا پیڑ مل ہی گیا۔ وہ اسی پیڑ کی جڑ کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ بارش رکنے کے انتظار میں وہ کئی گھنٹے پیڑ کے نیچے بیٹھی رہی۔
بارش جب رکی تو رات ہو چکی تھی۔ لکشمی گھبرا گئی۔ رات کے اندھیرے میں راستہ تلاش کرنا لکشمی کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس نے گڑیا سے کہا۔
" امّاں ! اندھیرا ہو گیا ہے۔ اس اندھیرے میں تو میں راستہ ہی نہیں دیکھ سکتی۔ کیا میں پیڑ پر چڑھ کر رات یہیں کاٹ لوں ۔ ؟ "
" ہاں ! بہو ہاں!!۔ رات یہیں کاٹ لے۔ "
لکشمی برگد کے پیڑ پر چڑھ کر ایک مضبوط ڈال پر بیٹھ گئی۔ ڈال پر بیٹھے بیٹھے اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ مگر اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دیا۔ لکشمی کو بڑی فکر ہونے لگی۔ ساری رات اسی پیڑ پر بیٹھے بیٹھے کاٹنی ہوگی۔ گڑیا اس کے ساتھ تھی۔ لکشمی کو اس سے بڑا سہارا تھا۔
آدھی رات سے زیادہ ڈھل چکی تھی۔ لکشمی ابھی تک پیڑ کی ڈال پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اچانک اُسے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ کہیں قریب ہی کچھ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اس نے غور سے دیکھا تو تین آدمی پیڑ کی طرف آتے ہوئے دکھائی دیے۔ لکشمی ڈر گئی۔ کہیں یہ لوگ پیڑ پر چڑھ کر اُسے دیکھ نہ لیں مگر۔ وہ تینوں پیڑ کے پاس آکر وہیں جڑ کے قریب زمین پر بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک نے موم بتّی جلائی۔ روشنی میں تینوں صاف صاف نظر آنے لگے۔ انھوں نے زمین پر ایک چادر بچھائی اور تھیلے کا سامان اس پر اُلٹ دیا۔ اس سامان میں سونے چاندی کے سکّے اور کچھ زیورات تھے۔ وہ تینوں ڈاکو تھے۔ انھوں نے اس رات جو مال لوٹا تھا اسی کا بٹوارا کرنے کے لیے وہ اس پیڑ کے نیچے جمع ہوئے تھے۔ مگر، تھوڑی دیر بعد ہی ان کے درمیان تکرار ہونے لگی، کیوں کہ تینوں میں سے ہر ایک بڑا حصّہ خود ہڑپ جانا چاہتا تھا۔ بحث کرتے کرتے جھگڑا شروع ہو گیا۔ نوبت گالی گلوچ اور ہاتھا پائی تک آ گئی۔

اُدھر پیڑ پر بیٹھی ہوئی لکشمی یہ سب دیکھ کر بہت گھبرا گئی۔ وہ ڈر کے مارے کانپنے لگی۔ ایک مرتبہ تو وہ گرتے گرتے بچی۔ اس نے اپنی ساس سے مشورہ کرنے کے لیے گڑیا نکالی۔ ٹھیک اسی وقت ایک ڈاکو بڑی زور سے چلاّیا۔ لکشمی کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ڈر کے مارے اس کے ہاتھ سے گڑیا چھوٹ گئی اور نیچے بیٹھے ہوئے ڈاکوؤں کے سردار کے سر پر جا گری۔

" باپ رے !۔ مَرا۔ " ڈاکوؤں کا سردار چلاّیا۔

" حملہ، ہم پر حملہ ہو گیا ہے۔ " دوسرا ڈاکو چیخا۔

" بھاگو ۔ ! " تیسرے نے آواز لگائی۔ اور تینوں ڈاکو سونا چاندی اور زیورات چھوڑ کر بھاگ گئے۔ پکڑے جانے کے خوف سے وہ جتنی تیزی سے ممکن تھا، بھاگتے چلے گئے۔

سویرا ہونے تک لکشمی پیڑ پر ہی بیٹھی رہی۔ جب اُجالا ہوا تو وہ نیچے اتری اور اپنی گڑیا تلاش کرنے

لگی۔ اس کی گڑیا سکّوں کے ایک ڈھیر پر پڑی تھی۔ اس نے گڑیا کو اٹھا کر اُس سے پوچھا۔
" ماں ! اب میں کیا کروں۔؟ کیا ان چیزوں کو اٹھا کر گھر لے چلوں۔ ؟ "
" ہاں بہو! لے چل مگر ساری چیزیں مالک کو لوٹا دینا۔ "
لکشمی کو کیا پتا کہ ان کا مالک کون ہے۔ پھر بھی اس نے تمام چیزیں سمیٹیں اور ڈاکوؤں کے تھیلے میں بھر کر گھر لے آئی۔ ابھی اُسے گھر پہنچے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ لکشمی ڈر گئی۔ اس نے سوچا کہ کہیں ڈاکو اپنا مال لینے نہ آ پہنچے ہوں۔ دروازے پر پھر آواز سنائی دی۔
لکشمی نے گڑیا سے پوچھا۔ " ماں ! کیا میں دروازہ کھول دوں ؟"
" ہاں بہو ! کیا پتا یہی مالک ہو۔ "
لکشمی نے دروازہ کھول دیا۔ دہلیز پر اس کا برسوں سے بچھڑا پتی کھڑا تھا۔ لکشمی اُسے دیکھتی رہ گئی۔
" لکشمی ! لکشمی !!" اس کے پتی نے کہا۔ " تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں تمہارا پتی ہوں۔ "
لکشمی نے آگے بڑھ کر اپنے پتی کے پیر چھوئے اور اندر آنے کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔
" میں تو ڈر گئی تھی۔ " اُس نے کہا۔ " میں نے سمجھا کہ شاید کوئی اپنی چیزیں لینے آیا ہے۔ "
" کیسی چیزیں۔؟ " اس کے پتی نے پوچھا۔
" آیئے ! آپ خود ہی دیکھ لیجیے۔ " لکشمی نے کہا اور اپنے پتی کو اندر لے جا کر وہ تمام چیزیں دکھائیں جنھیں وہ جنگل سے لائی تھی۔

" یہ سب تمہیں کس نے دیا۔ " اس کے پتی نے چلّا کر کہا۔
" ہوں ـــ! تو میری بیوی ڈاکوؤں سے ملی ہوئی ہے۔ میں ایسی بیوی کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔ میں ابھی اسی دم واپس جاتا ہوں۔ "
" نہیں — نہیں —" لکشمی نے کہا۔
" مجھے چھوڑ کر مت جایئے۔ مجھے بہت کچھ کہنا ہے۔ پہلے سب کچھ اچھی طرح سنیئے۔ "
پھر لکشمی نے پچھلی شام اور جنگل میں جو کچھ ہوا تھا کہہ سنایا۔
سب سن کر اس کے پتی نے کہا۔ " لکشمی ! میری اچھی بیوی ! کل شام میں برسوں بعد گھر لوٹ رہا تھا۔ اتنے سالوں میں میں نے جو کچھ کمایا تھا وہ سب میرے ساتھ تھا۔ راستے میں اچانک تین ڈاکوؤں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں نے بڑی چیخ پکار مچائی، پر کوئی مدد کو نہیں آیا۔ ڈاکو میرا سارا مال اسباب چھین کر جنگل میں بھاگ گئے۔ اب گھر آکر کیا دیکھتا ہوں کہ جو کچھ سونا چاندی، روپے، گہنے میں تمہارے لیے لا رہا تھا، وہ سب یہاں تمہارے پاس ہیں۔ اب یہ ساری دولت تمہاری ہے۔ "
" نہیں۔ " لکشمی نے کہا۔ " ماں جی نے مجھے کہا تھا کہ یہ دولت مالک کو لوٹا دینا۔ آپ مالک ہیں۔ اس لیے یہ دولت آپ کی ہے۔ "
" سو تو ٹھیک ہے۔ " اس کے پتی نے کہا۔ " دولت میری ضرور ہے، لیکن اب یہ ہماری دولت ہے۔ ہم دونوں ہی اس دولت کا استعمال کریں گے کیوں کہ اب ہم دونوں ایک ساتھ سُکھ سے رہنے والے ہیں۔ "
لکشمی نے اپنی گڑیا نکالی اور پوچھا۔
" ماں ! کیا میں اپنے پتی کے ساتھ سُکھ سے رہوں۔ ؟ "
" ہاں بہو ! ہاں۔ جیون بھر سُکھ سے رہ۔ "

تقدیر بنام تدبیر

یم لوک میں رہتے رہتے یم راج کی طبیعت اکتا گئی۔ ایک تو اندھیرے اور اداسی سے بھرا یم لوک اور اوپر سے رات دن اکیلے رہنا۔ یم لوک میں ان کے نوکر چاکر تو بہت تھے مگر دوست کوئی نہیں تھا۔ یوں یم راج موت کے دیوتا تھے مگر ان کی خواہش ہوئی کہ ایک مرتبہ زندگی کا لطف لیا جائے۔ وہ تبدیلی کے لیے بے چین ہو اٹھے۔

ایک دن انھوں نے دھرتی کی طرف دیکھا۔ وہاں خوب اُجالا تھا۔ دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ بسنت کا موسم تھا اور ہر طرف رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔ زمین پر رہنے والا ہر آدمی خوش نظر آرہا تھا۔ تبھی ان کی نظر ایک خوبصورت اور جوان عورت پر پڑی۔ وہ ایک طاقتور آدمی سے لڑ رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے اس آدمی کی وہ حالت ہوئی کہ اُسے اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑا۔

" ہاں۔ یہ عورت میرے لائق ہے۔" یم راج نے اپنے آپ سے کہا۔

" مجھے ایسی ہی عورت پسند ہے۔ مجھے اس سے شادی کر لینی چاہیے۔ "

" مگر سوال یہ تھا کہ اُسے حاصل کیسے کیا جائے۔ اگر یم دوتوں کو بھیجا جائے تو وہ اُسے مردہ حالت میں لائیں گے۔ اس کو حاصل کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ انسان بن کر زمین پر جایا جائے اور اس سے شادی کر لی جائے۔"

بس۔ پھر کیا تھا۔ یم راج دھرتی پر آپہنچے۔ لیکن وہ اپنی اصلی شکل موت کے دیوتا کی ڈراونی شکل میں نہیں بلکہ ایک خوبصورت نوجوان کے روپ میں اس کے پاس پہنچے۔ اور پھر جھٹ پٹ اس سے شادی کر لی۔

یم راج کی بیوی کا نام لتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ کئی سال ہنسی خوشی گذر گئے ۔ پھر ان کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اب لتا کا سارا وقت بچّے کی دیکھ بھال میں بیتنے لگا۔ اس نے اپنے شوہر یم کی طرف توجہ دینی کم کر دی۔ اپنی اور بچّے کی ضرورت کی چیزوں کی فرمائش زیادہ کرنی شروع کر دی۔ یم راج اپنی جانب سے پوری کوشش کرتے مگر لتا مطمئن نہیں ہوتی۔ جب یم راج اس کے پاس ہوتے تو ہر دم جھک جھک کرتی رہتی اور بار بار شکایت کرتی کہ وہ اس کی کوئی مدد نہیں کرتے۔

وقت کے ساتھ ساتھ لتا کی فرمائشیں اور جھک جھک بھی بڑھتی گئی رفتہ رفتہ گھر کا سارا سکون جاتا رہا۔ اس کے علاوہ لتا دن بدن تیزی سے بوڑھی ہوتی جارہی تھی۔ لیکن یم راج کی جوانی اب بھی برقرار تھی۔ وہ پہلے جیسے ہی جوان اور طاقتور تھے۔ اب یم راج کو پیسوں کی تنگی ہونے لگی تھی۔ وہ جتنا کماتے تھے گھر کے اخراجات اس سے کہیں زیادہ تھے۔ لتا چاہتی تھی اس کے پتی امیر ترین آدمی بن جائیں تاکہ وہ عیش و آرام کی زندگی گزار سکے۔ یہی سب کچھ دیکھ کر یم راج نے وید کا کام شروع کردیا۔ انھوں نے مختلف قسم کی گولیاں بنائیں اور مریضوں کو بیچنا شروع کردیں۔ کچھ ہی عرصہ میں ان کا دھندہ چل نکلا مگر لتا کے رنگ ڈھنگ بالکل نہیں بدلے۔ اس کی بک بک اور بھی بڑھ گئی۔ کچھ ہی دنوں میں نوبت یہاں تک آپہنچی کہ اس کی آواز سنتے ہی یم راج بھاگ کر کہیں چھپ جاتے۔

اب یم راج کو محسوس ہونے لگا کہ دھرتی کی زندگی سے یم لوک کی اندھیری اور اُداس زندگی کہیں بہتر تھی۔ ایک دن موقعہ دیکھ کر وہ دھرتی سے غائب ہو گئے۔

یم راج کے غائب ہونے پر لتا کو کوئی خاص فکر نہیں ہوئی۔ اُسے اپنے بیٹے یم کمار کی دیکھ بھال کرنے سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔ یم راج کے غائب ہونے سے اس کی صحت پر کوئی اثر نہ پڑا۔ ضرورت سے زیادہ لاڈ پیار کی وجہ سے اس کا لڑکا نِکما ہو گیا۔ جب وہ بڑا ہوا تو ایک نمبر کا کاہل اور آوارہ ہو کر رہ گیا۔

ایک دن اس کی ماں لتا بھی مر گئی۔ اب یم کمار تنہا تھا۔ اس نے نہ تو کچھ سیکھا تھا اور نہ کچھ پڑھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ روزی روٹی کے لیے کون سا اور کس طرح کا دھندا کرنا چاہیے۔ تبھی اسے اپنے باپ کے پیشے کی یاد آئی۔ اس نے اپنے باپ کی بنائی ہوئی دواؤں کی گولیاں نکالیں اور گذر بسر کے لیے انھیں ہی بیچنا شروع کر دیا۔

یم کمار اکثر سوچتا اس کے باپ کے ساتھ ایسا کیا واقعہ پیش آیا کہ وہ ایک دم غائب ہو گیا۔ ایک رات اس نے اپنے باپ کو خواب میں دیکھا۔

"بیٹا!" خواب میں اس کے باپ نے کہا۔

"تم وید کا دھندا جاری رکھو۔ اس سے تمہاری اچھی خاصی آمدنی ہو گی۔ مگر۔۔۔ میری ایک صلاح مان لو۔ جب کبھی تم کسی مریض کو

دیکھنے جاؤ تو سب سے پہلے اس کے سرہانے کی طرف دیکھنا۔ اگر وہاں میں بیٹھا ہوا ملوں تو اس مریض کے علاج سے انکار کر دینا، کیوں کہ وہ مریض ہر حالت میں مرنے والا ہوگا۔ مریض کے سرہانے بیٹھے ہوئے تمہارے علاوہ اور کوئی مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ اگر مریض کے سرہانے میں نہ ہوں تو تم اس کا علاج شروع کر دینا۔ تمہارے علاج سے وہ جلد ہی اچھا ہو جائے گا۔"

اُسی وقت یم کمار کی آنکھ کھل گئی۔ اگرچہ خواب عجیب سا تھا مگر یم کمار کو اس پر پورا یقین تھا۔ اس نے اپنے باپ کی صلاح ماننے کا پورا ارادہ کر لیا۔

یم کمار نے وید کا دھندا جاری رکھا۔ اس نے مختلف قسم کی چیزوں کو گھول گھال کر بہت سی دوائیں

تیار کیں۔ انھیں دواؤں سے وہ سب بیماریوں کا علاج کرنے لگا۔ لیکن جب وہ کسی مریض کا علاج کرتا تو سب سے پہلے مریض کے سرہانے کی طرف دیکھتا۔ اگر وہاں اس کے باپ بیٹھے ہوئے نہیں ہوتے تو اس کا علاج کرتا ورنہ منع کر دیتا تھا۔ لوگوں نے دیکھا یم کمار جس کا علاج کرتا وہ ہمیشہ اچھا ہو جاتا ہے اور جس کا علاج کرنے سے منع کر دیتا ہے وہ مر جاتا ہے۔

ایک دن راجہ کی لڑکی سخت بیمار پڑ گئی۔ ویدراج اس کو ٹھیک کرنے میں ناکام ہو گئے۔ ریاست بھر کے تمام بڑے بڑے وید اس کے علاج کے لیے بلائے گئے مگر کوئی بھی اس کو صحت یاب نہیں

کر سکا۔ آخر میں کسی نے یم کمار کا نام تجویز کیا۔ راجہ نے فوراً اسے بلوایا۔
جب یم کمار راجکماری کو دیکھنے آیا تو سب سے پہلے اس نے اس کے سرہانے کی طرف دیکھا۔ وہاں اس کے باپ یم راج بیٹھے ہوئے تھے۔ یم کمار نے سب لوگوں سے کمرے کے باہر جانے کو کہا۔ جب سب لوگ چلے گئے تو اس نے اپنے باپ سے کہا۔
" پتا جی ! میری زندگی کا سب سے سنہری موقعہ ہے۔ اگر راجکماری میرے علاج سے ٹھیک ہو گئی تو میں مالدار بھی ہو جاؤں گا میری شہرت بھی ہو جائے گی۔ میں آپ کے آگے ہاتھ
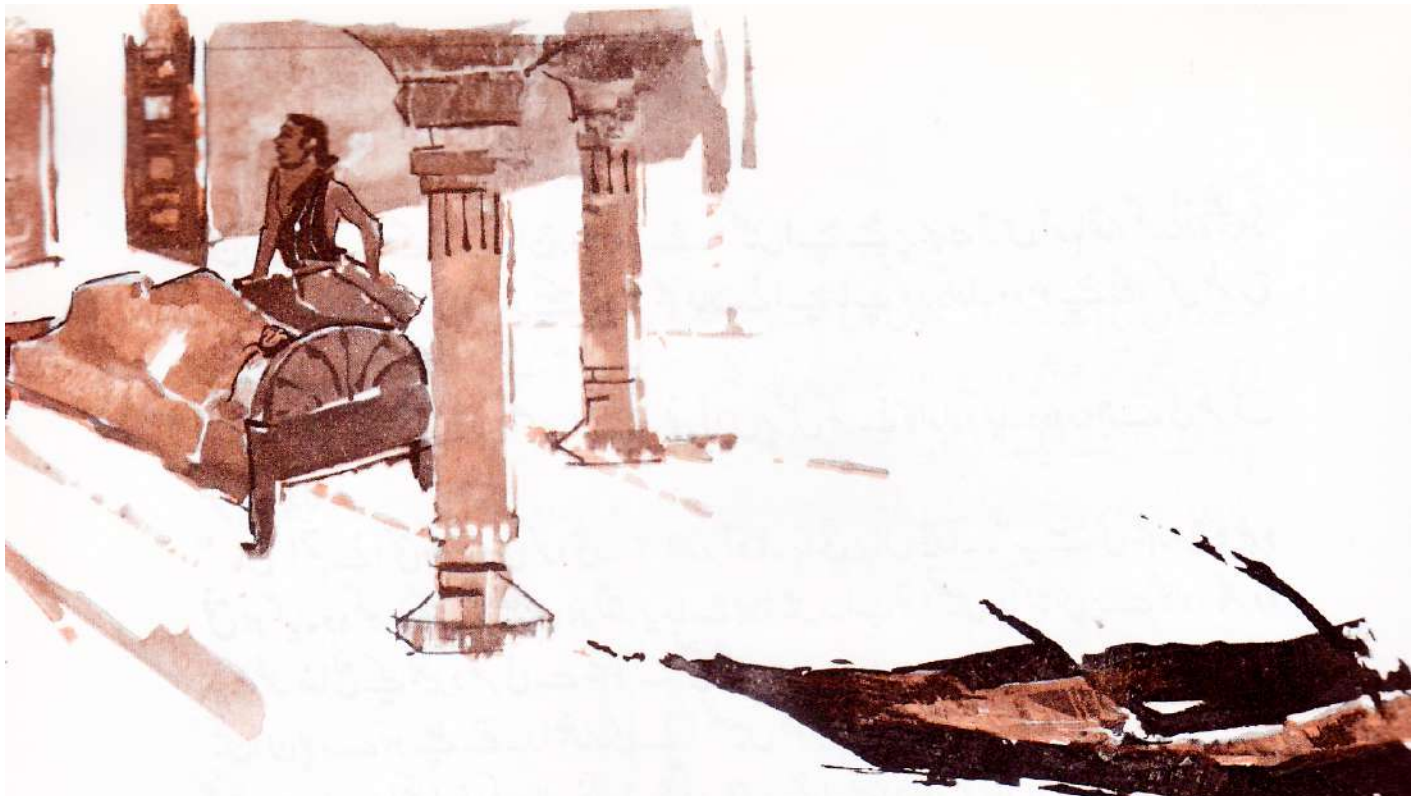
جوڑتا ہوں۔ مہربانی کر کے اسے چھوڑ دیجیے۔ یہاں سے چلے جائیے۔ "
" نہیں بیٹے ! نہیں۔ " یم راج نے کہا۔ " تم راجکماری کی جان کے بدلے مجھ سے کوئی اور چیز مانگ لو۔ کیوں کہ اسے مرنا ہی ہے۔ اس کی تقدیر نہ تو تم بدل سکتے ہو اور نہ میں ! "

یم کمار نے بہت گڑگڑا کر اور ہاتھ جوڑ کر خوشامد کی کہ وہ راجکماری کو چھوڑ دیں مگر یم راج کسی طرح بھی راضی نہیں ہوئے۔ یم کمار پھر بھی نااُمید نہیں ہوا۔ وہ بار بار منّت سماجت کرتا رہا۔ آخر یم راج بولے کہ تین دن تک راجکماری کو زندہ رہنے دیں گے۔ اس کے بعد اس کو مرنا ہی ہوگا۔ اتنا کہہ کر یم راج غائب ہو گئے۔

یم کمار بہت اداس ہو گیا۔ اس نے راجہ سے کہا کہ راجکماری کی حالت بہت خراب ہے۔ تین دن کے بعد ہی یہ بتایا جا سکتا ہے کہ وہ ٹھیک ہو گی یا نہیں۔ یم کمار کمرے میں بیٹھا بیمار راجکماری کو دیکھتا رہا۔ اس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ وہ نہ تو بل سکتی تھی اور نہ کروٹ لے سکتی تھی۔ اس کا چہرہ بالکل پیلا پڑ گیا تھا۔ وہ اپنی آنکھیں بھی نہیں کھول پا رہی تھی۔ یم کمار اس کا علاج کرنے سے معذور تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا اپنے باپ کے لوٹنے کا انتظار کرتا رہا۔

تین دن گذرنے کے بعد یم راج دوبارہ آئے۔ انھیں اپنے بیٹے پر بہت ترس آرہا تھا، مگر۔ وہ مجبور تھے۔ اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتے تھے۔ یم کمار نے اپنے باپ کو دیکھا۔ وہ سوچنے لگا، کس طرح راجکماری کی جان بچائی جائے۔ ؟

اچانک اُسے ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے فوراً اس پر عمل کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ دروازے کی طرف مڑا اور بولا :

'' ماں ! تم نے اتنی دیر کیوں کردی۔ ؟ اندر آؤ نا۔ پتاجی یہاں ہیں۔ ۔'' یہ سنتے ہی یم راج کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ گھبرا گئے۔ کچھ بھی ہو تقدیر جائے بھاڑ میں۔ اب تو انھیں بھاگنا ہی پڑے گا اور پھر وہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر دھرتی سے یم لوک پہنچ گئے۔

تین دن پورے ہو چکے تھے۔ راجکماری نے آنکھیں کھول دیں۔ یم کمار سمجھ گیا کہ اس کی تدبیر کام آ گئی ہے۔ اب راجکماری کی جان بچ جائے گی۔ اس نے اُسے دو چار گولیاں دیں اور راجہ کے پاس پیغام بھجوادیا کہ راجکماری ٹھیک ہو جائے گی۔

اس کے بعد راجکماری کی طبیعت تیزی سے سدھرنے لگی۔ کچھ ہی دنوں میں وہ مکمل صحت یاب ہو گئی۔ راجہ اور رانی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ انھوں نے یم کمار کا اس قدر احسان مانا کہ راجکماری کی شادی بھی اس کے ساتھ کردی۔

اس کے بعد وہ جب تک رہے بڑے خوش وخرم رہے۔
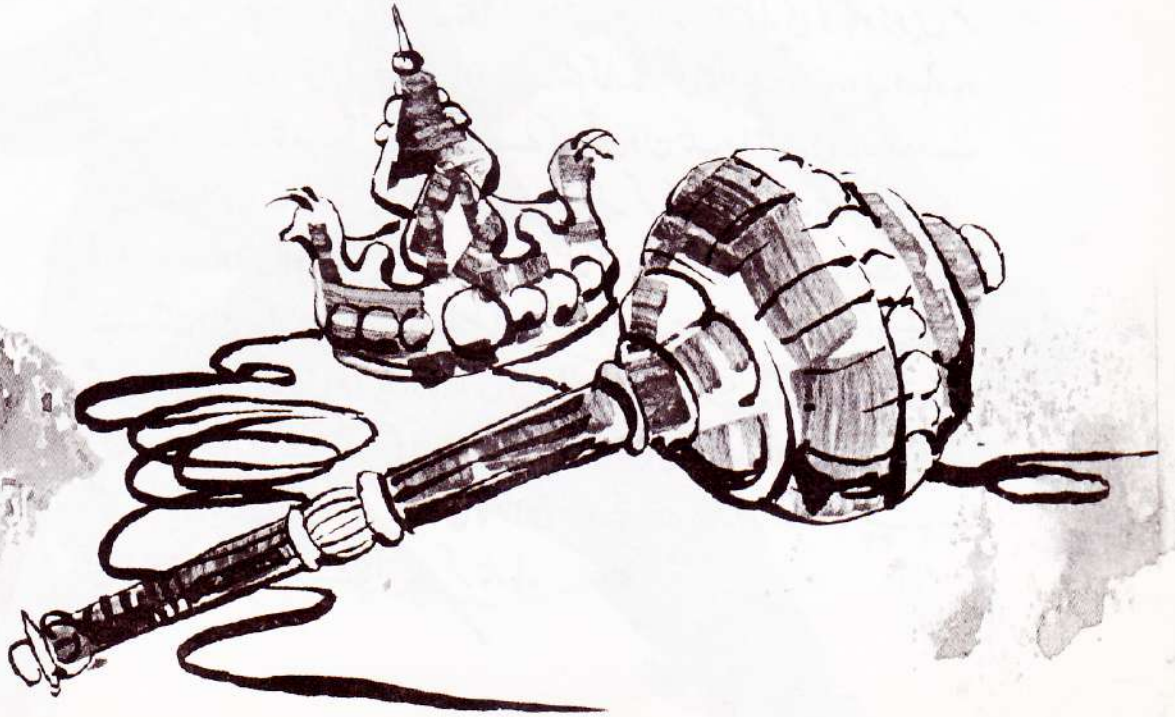
دَ کشنا

بہت دنوں کی بات ہے راجستھان میں ایک راجہ تھا۔ اس کا نام کمل سنگھ تھا۔ اُس کی حکومت بہت بڑی نہ تھی مگر پھر بھی وہ امیر اور خوشحال تھا۔ لیکن، کمل سنگھ کو سکون نہیں تھا۔ وہ بہت کچھ کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے ایک بڑی اور مضبوط فوج بنائی اور کچھ ہی دنوں میں ایک طاقتور راجہ بن گیا، لیکن زیادہ دولت اور طاقت آجانے کی وجہ سے وہ ضدی اور مغرور ہو گیا۔ وہ بے وقوفوں جیسے کام کرنے لگا۔
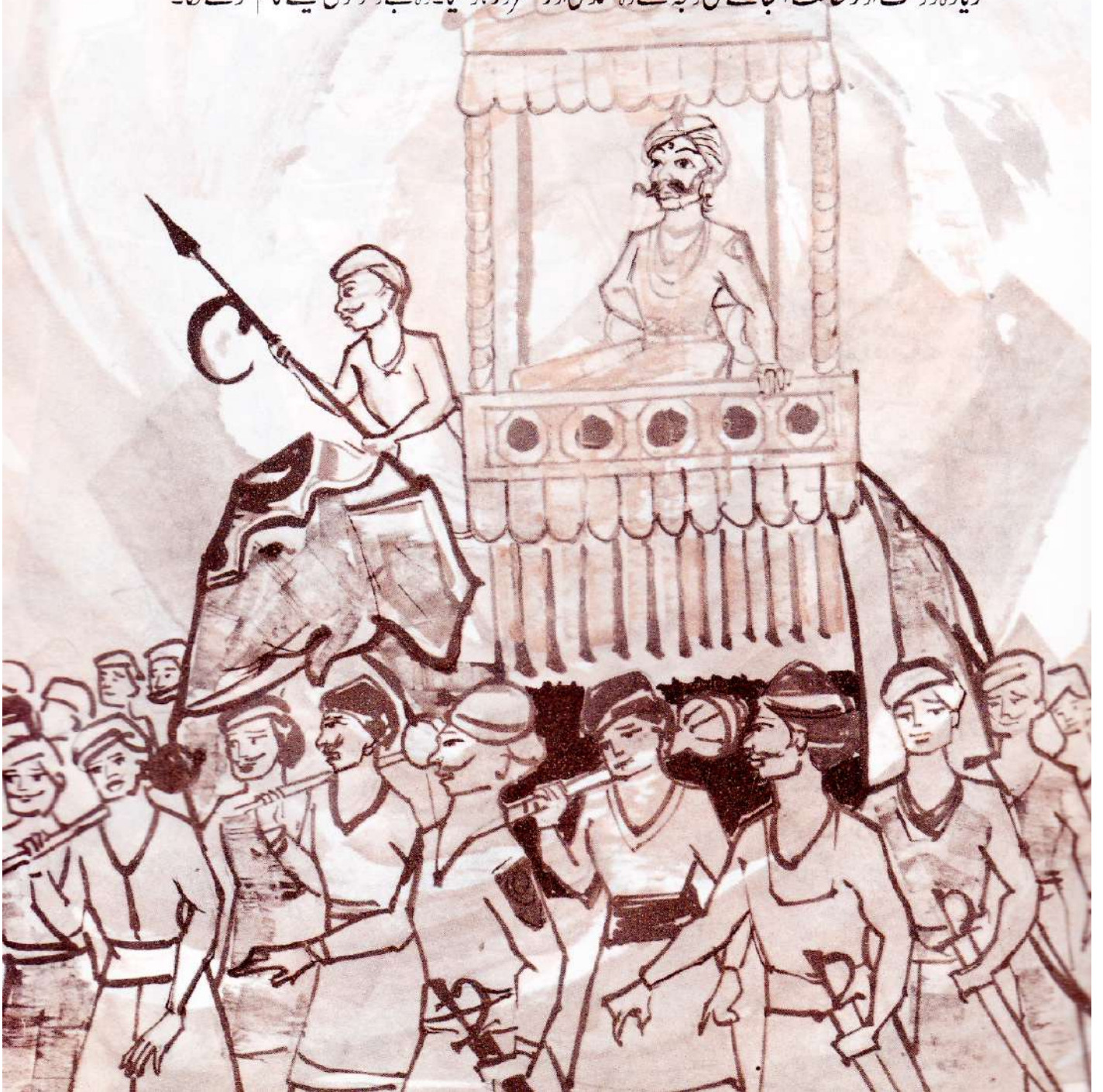
ایک دن کشمیر کے کچھ سوداگر اس کی ریاست میں آئے۔ وہ اپنے ساتھ بہت سی زعفران لائے تھے اور راجہ کے ہاتھ بیچنا چاہتے تھے۔ زعفران بہت قیمتی ہوتی ہے مگر راجہ ان سوداگروں کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ وہ کتنا امیر ہے اس لیے اس نے ساری زعفران خریدلی۔ اس کے بعد اس نے یہ حکم دیا کہ ساری زعفران کو ایک گڈھے میں پھینک دیا جائے۔

کمل سنگھ کی اس احمقانہ حرکت پر دولت کی دیوی لکشمی ناراض ہو گئی۔ اس نے اس بے وقوف راجہ کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔ راجہ کی عقل خراب ہو گئی۔ وہ جوا کھیلنے لگا۔

اب وہ دن رات جوا کھیلتا رہتا۔ دھیرے دھیرے وہ اپنی ساری دولت اور ریاست بھی جوے میں ہار گیا۔ اب وہ بے حد غریب ہو گیا۔ بے عزتی، غربت اور مایوسی کی وجہ سے وہ حکومت چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا۔ اس کے ساتھ اس کا لڑکا اشونی اور بہو دکشنا بھی تھی۔

دُکھی من سے اپنے سوچ ہوئے پیروں کو گھسیٹتے ہوئے وہ چلتے رہے چلتے چلتے وہ ایک ریاست کی راجدھانی میں پہنچے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے فیصلہ کیا وہ یہیں رہ کر اپنی قسمت کو آزمائیں گے۔ انھوں نے رہنے کے لیے شہر کے باہر ایک جھونپڑی ڈال لی اور گزر بسر کے لیے محنت مزدوری کرنے لگے۔ راجہ اور راج کمار دونوں کبھی پتھر توڑتے، کبھی بوجھا اٹھاتے، کنوئیں سے پانی کھینچتے اور اسی قسم کے اور بھی بہت سے کام کرتے تھے۔

راجہ کی بہو دکشنا بہت بھلی اور سمجھ دار لڑکی تھی۔ وہ ہر حال میں خوش رہتی تھی۔ محنت سے کام کرتی اور گھر کو سنوار کر رکھتی تھی۔ اس نے اپنے شوہر اور سسُر سے کہہ رکھا تھا وہ دن بھر کی کمائی کے علاوہ گھر میں روزانہ کوئی نہ کوئی چیز لے کر آئیں۔ دونوں نے اس کی بات کو پوری طرح سمجھ لیا تھا۔ وہ ہر روز مزدوری کے علاوہ کوئی نہ کوئی چیز بھی ساتھ لاتے تھے۔ کبھی اینٹ کا ٹکڑا ہی اٹھا لاتے۔ کبھی لکڑی کا کُندا لاد لاتے اور کبھی کوئی ٹیڑھا میڑھا پتھر یا سبزی ترکاری لے آتے۔ جو کچھ بھی انھیں ملتا اسی کو دکشنا کے پاس لا کر رکھ دیتے۔

ایک دن انھیں ایک مرے ہوئے سانپ کے
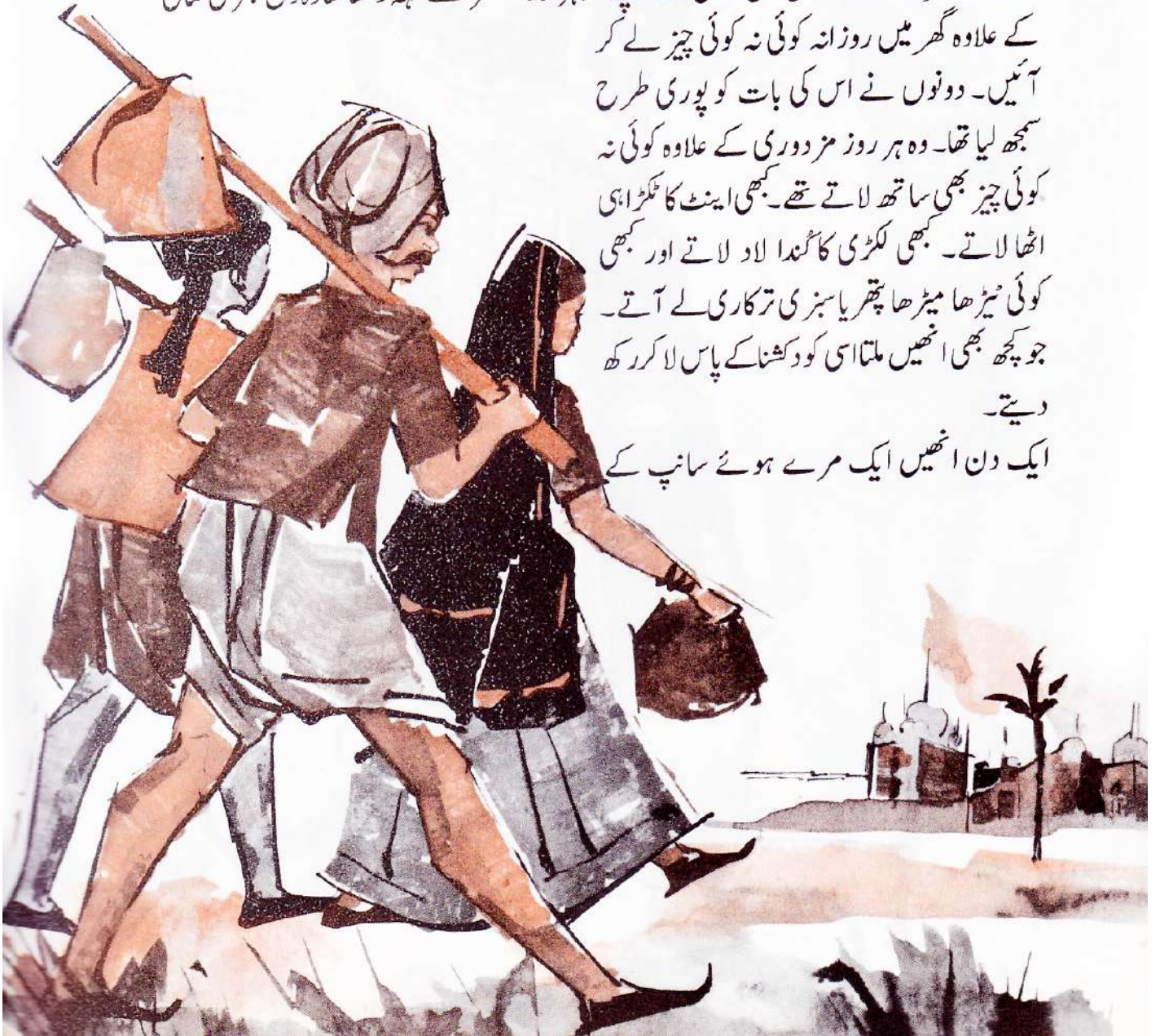
علاوہ کچھ نہیں ملا۔ اشونی نے سانپ کو دُم سے اٹھایا اور اسی کو لے کر گھر آ گیا۔ گھر پہنچ کر اس نے مردہ سانپ کو جھونپڑی کی چھت پر ڈال دیا۔
دوسرے دن جب کمل سنگھ اور اس کا بیٹا گھر لوٹ رہے تھے تو انھوں نے دیکھا کہ شہر میں سنسنی پھیلی ہوئی ہے۔ انھوں نے ایک راہ گیر کو روک کر پوچھا کہ ماجرا کیا ہے۔ ؟ "
" اتنی سی بات بھی معلوم نہیں۔ ؟ " اس آدمی نے جواب دیا آج صبح ہی صبح رانی کا ایک قیمتی ہار کھو گیا ہے۔ وہ ہار کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھا ہوا تھا۔ اچانک کہیں سے ایک چیل آئی اور ایک ہی جھپٹے میں اڑا کر لے گئی۔ راجہ نے اعلان کروایا ہے کہ اگر کوئی اس ہار کو لا دے گا تو اسے بہت سا انعام دیا جائے گا۔
جب کمل سنگھ اور اشونی گھر آئے تو انھوں نے رانی کے ہار کی بات دکشنا کو بتائی۔
" رانی کا ہار ! " دکشنا نے چونک کر کہا۔
" میرا خیال ہے کہ وہ ہار میرے پاس ہے۔ " ایسا کہتے کہتے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔
" ہار اور تمہارے پاس۔ " وہ دونوں ایک ساتھ بول اٹھے۔
" تمہارے پاس ہار کہاں سے آیا۔ ؟ "
" میں نے کہہ دیا کہ رانی کا ہار میرے پاس ہے۔ اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں بتاؤں گی۔ " دکشنا نے زور دے کر کہا۔
" جاؤ فوراً محل میں جاؤ اور پتا لگا کے آؤ کہ اس کو لوٹانے پر کیا انعام ملنے والا ہے۔ ؟ "
اشونی دوڑا دوڑا محل پہنچا اور چلّا کر بولا۔
" راجہ کے نوکر ! اگر ہار کا پتا لگ جائے تو مہاراج ہار لانے والے کو کیا انعام دیں گے۔ ؟ "
محل کے افسروں کو اس بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ راجہ سے پوچھنے گئے۔ راجہ نے کہا۔
" اُس آدمی سے کہہ دو کہ ہار لانے والے کو کوئی بھی مناسب چیز جو وہ مانگے گا۔ دی جائے گی۔ "
اشونی نے یہی بات گھر آ کر دکشنا کو بتا دی۔
" تو چلو، جلدی کرو۔ " دکشنا نے کہا۔ " ہم راجہ کے پاس چلتے ہیں۔ "
دکشنا اپنے شوہر اشونی کے ساتھ محل کی طرف چل دی۔ محل پہنچنے پر وہ راجہ رانی سے ملے۔ پھر دکشنا نے نہایت ادب سے وہ ہار رانی کو سونپ دیا۔
" مہارانی جی ! کیا آپ کا کھویا ہوا ہار یہی ہے۔ ؟ " اس نے پوچھا۔

" ہاں ! ہاں !!یہی ہے۔ " رانی نے خوش ہو کر کہا۔
" مگر۔ یہ تمہیں کیسے ملا۔ ؟" "مہارانی جی! " دکشنا نے جواب دیا۔
" آج سویرے میں اپنی چھوٹی سی جھونپڑی کے باہر کھڑی تھی کہ تبھی ایک چیل آئی اور جھونپڑی کی چھت پر بیٹھ گئی۔ یہ ہار اس کی چونچ میں تھا۔ ہوا یہ کہ میری جھونپڑی کی چھت پر ایک مرا ہوا سانپ پڑا تھا۔ چیل نے ہار تو گرا دیا اور سانپ اٹھا کر اڑ گئی۔"
" کیا قسمت ہے۔ ؟ "رانی نے کہا۔ " میں تو سوچ رہی تھی کہ اب یہ ہار نہیں ملنے والا۔ ہم تمہارے

بڑے احسان مند ہیں۔اب تم بتاؤاس کے بدلے میں تم کیاانعام لیناچاہو گی؟''
دکشنا نے کہا۔ '' مہاراج اور مہارانی جی!اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں ایک گزارش کرنا چاہتی ہوں کہ مجھے نہ تو روپیہ چاہیے اور نہ زمین۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ دیوالی کی رات کو شاہی محل سمیت شہر کے کسی بھی مکان میں دیئے نہ جلائے جائیں۔اگر کوئی دیا جلانا ہی چاہے، تو میری جھونپڑی میں آئے اور اس کے چاروں طرف دیئے جلائے۔
یہ انوکھی خواہش سن کر راجہ اور رانی کو بڑا تعجب ہوا۔انھیں دیوالی کی رات دیئے نہ جلانے کی بات پسند تو نہیں تھی مگر وہ دکشنا کو دیا گیا اپنا وچن بھی پورا کرنا چاہتے تھے۔اس لیے شہر میں منا ہی کرادی گئی کہ دیوالی کی رات تمام دیئے دکشنا کی جھونپڑی کے چاروں طرف جلائے جائیں۔ دوسری جگہ کہیں بھی روشنی نہ کی جائے۔
کچھ ہی دنوں بعد دیوالی بھی آگئی لیکن اس رات دکشِنا کی جھونپڑی کو چھوڑ کر شہر میں کہیں اوراجالا نہیں تھا۔ رات کو جب دولت کی دیوی لکشمی شہر میں آئی تو چاروں طرف اندھیرا دیکھ کر گھبرا گئی۔گہرے اندھیرے کی وجہ سے وہ کسی کے گھر میں نہیں جاسکی۔بہت دیر تک بھٹکنے کے بعد اس نے دیکھا کہ شہر سے باہر ایک جھونپڑی میں اُجالا ہو رہا ہے۔وہ یہ سوچ کر اس جھونپڑی کی طرف بڑھی کہ رات بتانے کو کم از کم جگہ تو ملی، لیکن جھونپڑی کے باہر ہاتھ میں ڈنڈا لیے دکشنا کھڑی تھی۔
'' ٹھہرو ! '' اس نے لکشمی کو جھونپڑی میں گھستے ہوئے دیکھ کر کہا۔
'' میری چھت کے نیچے تمہیں پناہ نہیں مل سکتی۔ ''
'' کیا مطلب ہے تمہارا۔ ؟ ''دیوی لکشمی کی بھنویں چڑھ گئیں۔انھوں نے آگے کہا۔
'' اے لڑکی !تمہارے گھر کے علاوہ شہر کے تمام مکانوں میں اندھیرا کیوں ہے۔؟ اور تم اپنے گھر میں مجھے آنے کیوں نہیں دیتی ہو۔ ؟ ''
'' کیوں آنے دوں۔؟ '' دکشنا نے اونچی آواز میں کہا۔
'' کیا تم نے ہم سے کوئی اچھا سلوک کیا ہے۔؟ تمہارے دل میں ہمارے لیے ذرا بھی ہمدردی نہیں۔ وہ تم ہی تو ہو جس نے ہماری زندگی برباد کی اور وہ بھی ذراسی بات پر غصّے سے بگڑ کر۔ ''
'' مہربانی کر کے آج کی رات مجھے جھونپڑی میں گزارنے دو۔ ''
لکشمی نے کہا۔ ''میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمھاری ہر طرح مدد کروں گی۔ میں تمہارا کھویا ہوا راج

بھی لوٹا دوں گی۔" یہ سن کر دکشنا خوشی سے کھِل اُٹھی۔ وہ دیوی لکشمی کو جھونپڑی کے اندر لائی۔ لکشمی نے وہ رات وہیں گزاری اور کمل سنگھ کے گھر کو خوشحالی کا آشیرواد دیا۔

دوسرے دن دکشنا نے دیکھا کہ اس کی جھونپڑی سونے اور جواہرات سے بھری پڑی ہے۔ اس کے بعد کمل سنگھ، اشونی اور اس کی سمجھ دار بیوی دکشنا اپنے راج کو واپس لوٹ آئے۔ لکشمی کی مہربانی سے کچھ ہی دنوں میں ان کا کھویا ہوا راج بھی واپس مل گیا۔
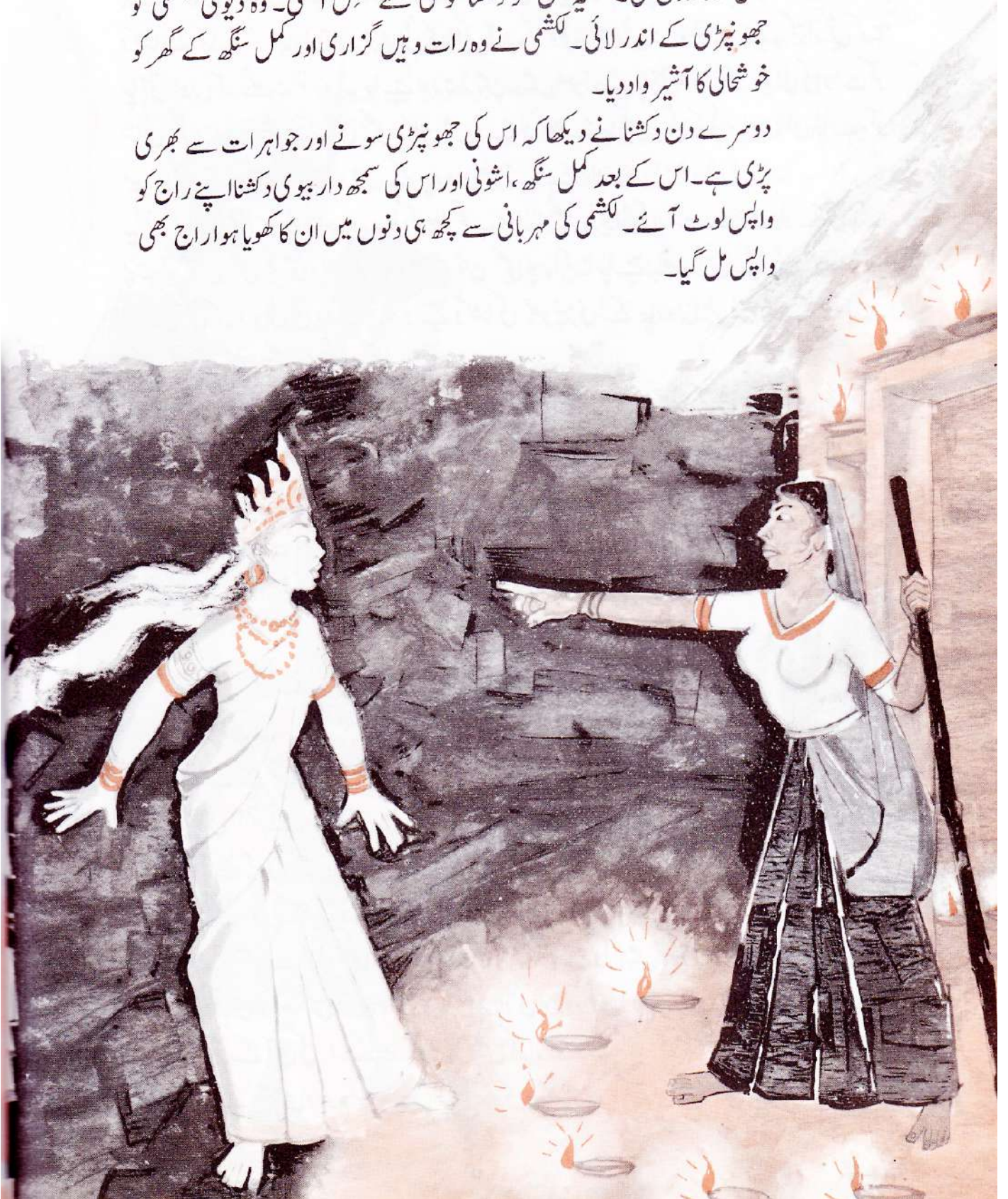
سونے کی دُم والا سانپ

آسام کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک غریب کسان رہتا تھا۔ اس کی بیوی کا نام سُجاتا تھا۔ اس کے سات بیٹے تھے۔ اتنے بڑے خاندان کی پرورش کرنے کے لیے کسان اوراس کی بیوی کو سخت محنت کرنی پڑتی تھی۔

کسان ہر روز سویرے کھیت پر جاتااور شام ہونے تک جی توڑ محنت کرتا۔ اسی طرح سجاتا بھی گھر میں دن بھر کام کاج میں مصروف رہتی۔

وہ سارے گھر کی صفائی کرتی۔ ندی سے پانی بھر کر لاتی۔ جنگل جاکر لکڑیاں چنتی، اور سارے خاندان کے لیے کھانا بناتی۔ مگر—

ان کے ساتوں لڑکے بہت کام چور اور کاہل تھے۔ خاندان کی غربت کو دیکھ کر بھی نہ تو وہ ماں کی ہی مدد کرتے تھے اور نہ ہی اپنے باپ کے کام میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ اس سے ان کی ماں بڑی اداس رہتی۔ وہ رات دن خدا سے دعا مانگتی۔

"ہے بھگوان! مجھے ایک اور بیٹا دے دے۔ ایسا بیٹا جو ہمارے کام آئے۔" گاؤں والے کہتے کہ ان کا اگلا بیٹا بڑا

خوش نصیب ہو گا۔ کسان اور اس کی بیوی کو اس بات کا پورا یقین ہو گیا کہ ان کا آٹھواں بیٹا ضرور ان ساتوں سے مختلف ہو گا۔ مگر— جب ان کا اگلا بیٹا پیدا ہوا تو عام بچوں کی طرح نہیں تھا۔ وہ ایک لمبّا سانپ تھا۔

پیدا ہوتے ہی وہ رینگتا ہوا گھر سے باہر نکلا اور جنگل میں غائب ہو گیا۔ سجاتا پہلے ہی دُکھی تھی کہ اس کا بچّہ انسان نہیں، سانپ ہے اب اس کے اس طرح غائب ہو جانے پر اسے اور بھی زیادہ دکھ اور افسوس ہونے لگا۔ وہ اپنی قسمت پر کئی دنوں تک روتی رہی۔

ایک رات سُجاتا کو ایک خواب دکھائی دیا۔ خواب میں اس نے دیکھا کہ اس کا سانپ بیٹا اس کی گود میں لیٹا ہوا ہے اور اس سے کہہ رہا ہے۔

" ماں ! میرے بارے میں اتنی دکھی کیوں ہوتی ہو۔ ؟ میں جو سانپ بن کر پیدا ہوا ہوں اس کی وجہ ایک بددُعا (شراپ) ہے۔ "

" شراپ ۔ کیسا شراپ ؟"

" میں پہلے ایک بہت امیر آدمی تھا۔ " سانپ نے جواب دیا۔

" میں نے ڈھیروں سونا جمع کر رکھا تھا۔ اپنے مال و دولت میں سے میں کسی کو یہاں تک کہ اپنی ماں کو بھی ایک پیسہ نہیں دیتا تھا۔ میرے پاس اتنی دولت ہونے کے باوجود وہ بھوکی پیاسی مر گئی۔ میرا یہ پاپ اس قدر بڑا تھا کہ میں آج سانپ بن کر پیدا ہوا ہوں۔ مجھے اپنے بُرے کاموں پر بڑا پچھتاوا ہے اب اس کا کفّارہ ادا کرنے کے لیے میں تمہیں ہر روز ایک انچ سونا دیا کروں گا۔ "

" ایک انچ سونا۔ " سُجاتا نے پوچھا۔

" ہاں !ہر روز ایک انچ سونا۔ " سانپ نے جواب دیا۔ " کل سے میں ایک پیالا دودھ پینے کے لیے ہر روز گھر آیا کروں گا۔ جب میں دودھ پی چکوں تو تم میری پوچھ کا ایک حصّہ کاٹ لیا کرنا۔ وہ ٹکڑا فوراً سونا بن جائے گا۔ "

" لیکن، میرے بچّے اس سے تو تمہیں تکلیف ہو گی۔ "

" نہیں ماں۔ " سانپ نے جواب دیا۔ " اس سے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ " اس کے بعد خواب ختم ہو گیا۔ سُجاتا کی آنکھ کھلی تو وہ کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس نے سوچا کہ سانپ شاید کمرے میں ہی ہو گا۔ مگر، وہاں کچھ نہیں تھا۔ لیکن سُجاتا کو اپنے خواب پر یقین تھا۔ اُسے لگ رہا تھا کہ خواب کی بات سچ ہونے والی ہے۔
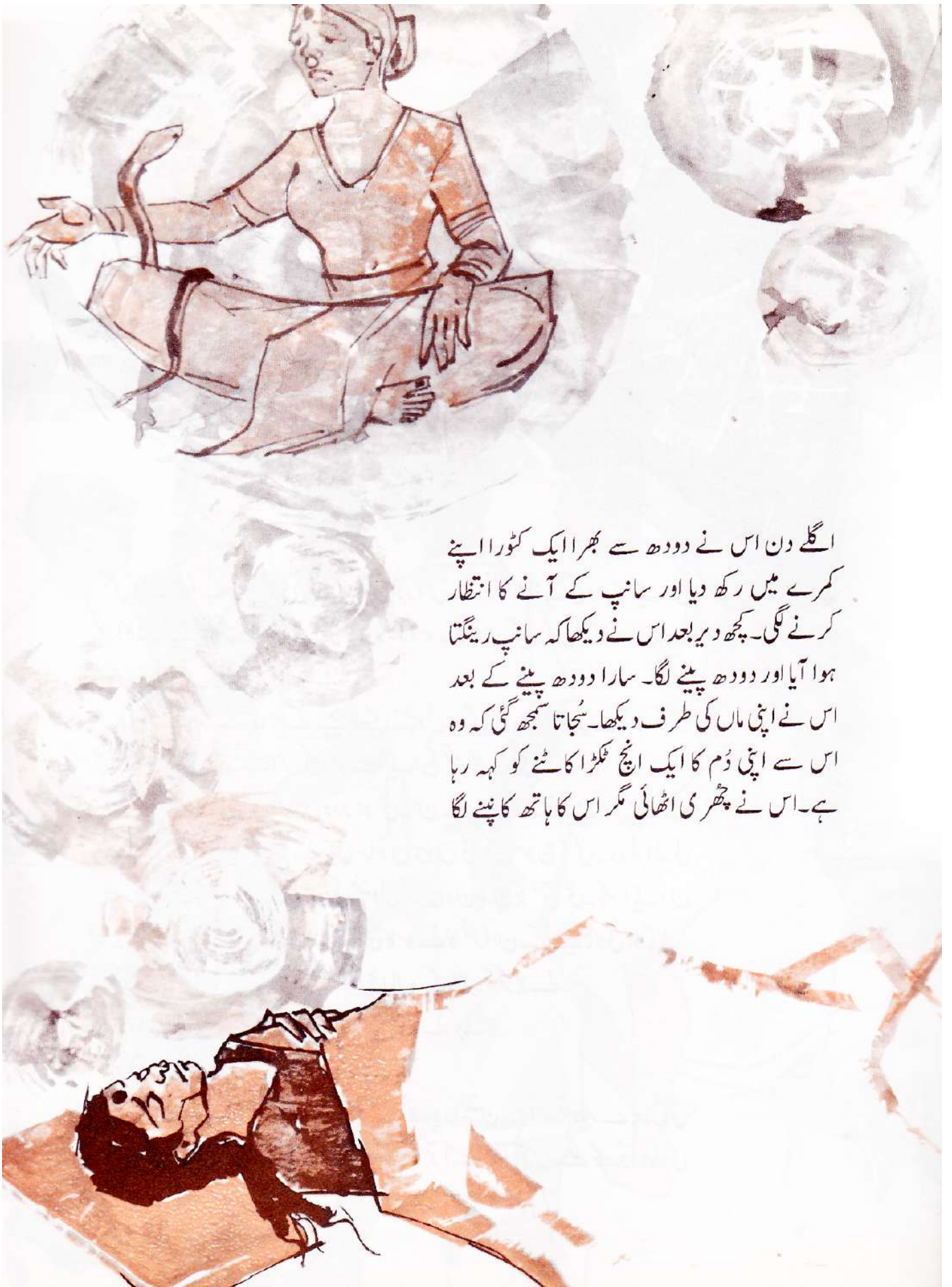
اگلے دن اس نے دودھ سے بھرا ایک کٹورا اپنے
کمرے میں رکھ دیا اور سانپ کے آنے کا انتظار
کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے دیکھا کہ سانپ رینگتا
ہوا آیا اور دودھ پینے لگا۔ سارا دودھ پینے کے بعد
اس نے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ سُجاتا سمجھ گئی کہ وہ
اس سے اپنی دُم کا ایک انچ ٹکڑا کاٹنے کو کہہ رہا
ہے۔ اس نے چھُری اٹھائی مگر اس کا ہاتھ کانپنے لگا

تبھی اسے خواب کی آخری بات یاد آئی اور اس نے فوراً سانپ کی دم کا ایک انچ ٹکڑا کاٹ لیا۔ دُم سے الگ ہوتے ہی وہ ٹکڑا سونے کا بن گیا۔ اس کے بعد سانپ واپس جنگل میں چلا گیا۔

اس دن کے بعد سے سُجاتا کے بیٹے کا یہی معمول ہو گیا۔ وہ روز سویرے آتا، کٹورا بھر دودھ پیتا اور پھر سُجاتا اس کی دم سے ایک انچ ٹکڑا کاٹ لیتی۔

بہت جلد، ان لوگوں کی غریبی دور ہو گئی۔ ان کے پاس کھانے پینے اور پہننے کے لیے بہت کچھ ہو گیا۔ سُجاتا کے باقی ساتوں بیٹوں کی بھی موج آ گئی۔ وہ فراخدلی سے روپیہ خرچ کرنے لگے۔ ان کی فضول خرچی دن بدن بڑھتی گئی۔ پھر ایک دن ایسی نوبت آ گئی کہ روز ملنے والا ایک انچ کا سونے کا ٹکڑا ان کے لیے ناکافی ہو گیا۔

"ہمیں کچھ اور روپیہ چاہیے۔" وہ اپنی ماں کے پاس آ کر بولے۔

"روز ایک انچ سونے کا ٹکڑا ملتا ہے۔" سُجاتا نے کہا۔

"جو ملتا ہے ہمیں اسی میں کام چلانا چاہیئے۔"

اس پر سب سے بڑے لڑکے نے کہا۔ "مجھے پورا یقین ہے اگر تم ہمارے بھائی کی دُم میں سے ایک انچ سے زیادہ ٹکڑا کاٹ لو تو اُسے بُرا نہیں لگے گا۔ وہ ہماری

دشواریوں کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ بلکہ میں تو سمجھتا ہوں اُسے ہماری مدد کرنے میں یقیناً خوشی ہوگی۔"

"نہیں۔" سُجاتا نے کہا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں ایک انچ سے زیادہ بڑا ٹکڑا نہیں لے سکتی۔"
مگر اس کے بیٹوں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ روز اس سے ضد کرتے۔ کبھی بحث کرتے، کبھی ہاتھ جوڑتے اور کبھی گڑگڑانے لگتے۔ ایک دن تنگ آکر سجاتا ان کی بات ماننے پر راضی ہو گئی۔ اس نے سوچا۔ ہو سکتا ہے کہ ایک انچ سے زائد کا ٹکڑا کاٹنے میں کوئی نقصان نہ ہو۔

اگلے دن جب سانپ دودھ پینے آیا تو اس نے اس کی دم سے ایک انچ کی بجائے دو انچ کا ٹکڑا کاٹ لیا، لیکن دُم کے کٹتے ہی اس کی دم سے خون بہنے لگا اور کچھ ہی منٹوں میں سانپ تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ سُجاتا کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس کے دکھ کے کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔

جب اس کے ساتوں بیٹے آئے تو انھوں نے اپنی ماں کو روتے دیکھا۔ اُن میں سے ایک نے سانپ کی دم کا کٹا ہوا دو انچ کا ٹکڑا اٹھا کر دیکھا تو وہ پہلے کی طرح سونے کا نہیں بلکہ معمولی دم کا ٹکڑا رہ گیا تھا۔

"ہے بھگوان۔" وہ چلّا ئے۔ "سونا تو ملا نہیں اوپر سے سانپ بھی چلا گیا۔"

اس کے بعد وہ ساتوں بھی وہیں بیٹھ کر رونے لگے۔

ننانوے کا پھیر

کسی زمانے کی بات ہے، کیرل میں راموا اور دامو نام کے دو آدمی رہتے تھے۔ وہ دونوں پڑوسی تھے۔ ان کے مکان بھی ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ رامو سوداگر تھا اور اس کا کام اچھا خاصا چل رہا تھا۔ دامو معمولی آدمی تھا اور محنت مزدوری کر کے گذر بسر کر رہا تھا۔

رامو امیر ہونے کے باوجود بے حد کنجوس تھا۔ وہ بہت کفایت اور کنجوسی سے خرچ کرتا تھا۔ یہاں تک کہ کھانے پینے میں بھی وہ خرچ کرتے ہوئے گھبراتا تھا۔ دونوں میاں بیوی ایک ہی سبزی یا دال سے پورا دن گذارا کرتے۔ کبھی کسی کو اپنے یہاں دعوت پر نہیں بلاتے تھے۔

اُدھر دامو غریب ہونے کے باوجود بڑے مزے کی زندگی گذار رہا تھا۔ وہ اور اس کی بیوی جو کچھ کماتے سارا خرچ کر ڈالتے۔ اچھا پہنتے اور اچھا کھاتے۔ اپنے دوستوں اور رشتے داروں کو اکثر اپنے یہاں کھانے پر بلاتے۔ رات میں فرصت کے لمحات میں کھڑ تال یا تالیاں بجا کر طرح طرح کے گانے گاتے۔

رامو کی بیوی کا نام شوبھا تھا۔ وہ اکثر سوچتی، یہ دامو اتنی کم آمدنی میں کس طرح ٹھاٹھ سے رہ لیتا ہے۔ کیسے اتنا روپیہ خرچ کر لیتا ہے کہ اسے کوئی فکر یا پریشانی نہیں۔

شوبھا کے پتی کے پاس دامو سے کہیں زیادہ روپیہ پیسہ تھا۔ پھر بھی اس کے لیے بچت کرنا بڑا مشکل تھا۔ وہ کئی بار کچھ خریدنا چاہتے مگر نہیں خرید پاتے تھے۔ وہ اکثر دامو اور اس کی بیوی چارو کو دیکھتی رہتی اور ان کی خوشحال زندگی کا راز جاننے کی کوشش کرتی۔ مگر ہزار سوچنے پر بھی اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔

دوپہر کے وقت شوبھا اور چارو اکثر اپنے اپنے دروازے پر کھڑے ہو کر باتیں کرتیں۔ ان کے

مکانوں کے درمیان ایک باڑ تھی۔ وہ باڑ کے اندر سے جھانکتی ہوئیں دیر تک باتیں کرتی تھیں۔ ایک بار جب ایسے ہی کھڑی باتیں کر رہی تھیں کہ شوبھا نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ اس نے چارو سے پوچھا کہ وہ ہمیشہ اتنے ٹھاٹھ سے کیسے خرچ کر لیتے ہیں اور ایسی بے فکری اور خوشحالی کی زندگی کیسے گذار رہے ہیں۔؟

"میں کیا جانوں۔؟" چارو نے مسکرا کر جواب دیا۔

"میرے خیال میں تو یہ بات میرے پتی کو بھی معلوم نہیں۔ ہو سکتا ہے تمہارے پتی جانتے ہوں۔ وہ تو بہت سمجھ دار ہیں ــــ ہیں نا۔"

اس جواب سے شوبھا کی تسلّی نہیں ہوئی۔ اس نے اپنا سوال اپنے پتی کے سامنے رکھا۔ جیسا کہ

چارو نے کہا تھا، اس کا پتی بہت ہی چالاک آدمی تھا۔ داموکے بارے میں اپنی بیوی کا سوال سن کر رامو مسکرانے لگا۔

"میری رانی!" اس نے کہا۔ "داموا اور اس کی بیوی جو بے فکری کی زندگی گذار رہے ہیں اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ بے چارہ داموا بھی ننّانوے کے پھیر میں نہیں پڑا ہے۔"

"ننّانوے کا پھیر۔ یہ کیا ہوتا ہے۔؟" اس کی بیوی نے پوچھا "میں تو خاک بھی نہیں سمجھی۔"

"سمجھاؤں تو بھی تم نہیں سمجھوگی۔" رامو نے کہا۔ "اس لیے سمجھانا بھی فضول ہے۔ کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں سمجھنے سے پہلے خود دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔"

شوبھا نے اور کچھ نہیں پوچھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا شوہر زبانی جمع خرچ سے زیادہ کام میں یقین رکھتا ہے۔ جو بات وہ کہنا نہیں چاہتا اسے کہلوانا بھی مشکل ہے۔ اس لیے مزید کچھ پوچھنا بیکار تھا۔

"کچھ دن اور ٹھہرو۔ تم اپنے آپ سمجھ جاؤگی۔" رامو نے آگے کہا۔ اس جواب سے اس کی بیوی مطمئن ہو گئی۔

کچھ دن بعد شوبھا نے دیکھا کہ پڑوسی کا گھر کچھ بدلا بدلا نظر آرہا ہے۔ کہیں کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔
دامو اور اس کی بیوی کے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے تھے۔ اب ان کے گھر سے نہ تو مچھلی تلنے کی
خوشبو آتی تھی اور نہ ہی گوشت کے بھوننے کی۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ دامو کے گھر دوست اور
رشتے دار تو آتے تھے لیکن پہلے کی طرح ان کی دعوتیں نہیں ہوتی تھیں اور تو اور پہلے کی طرح وہ
راتوں کو گانا بجانا بھی ختم ہو گیا تھا۔ چارو دن بھر بیٹھی ناریل کے پتّوں کی چٹائیاں بنتی رہتی اور شام

ہوتے ہی انھیں بازار میں بیچنے چلی جاتی۔ رات کے وقت دامو بھی چارو کے ساتھ بیٹھ جاتا اور پھر دونوں چٹائیاں بننے لگتے۔

" یہ کیا عجوبہ ہے۔ ؟ " شوبھا نے دل ہی دل میں کہا۔

" جانے اس گھر میں کیا ہو گیا ہے۔ ؟ ان لوگوں کو اپنے کام سے منٹ بھر کی فرصت نہیں۔ اس کے علاوہ دونوں بڑے فکر مند نظر آتے ہیں۔ لگتا ہے یہ لوگ زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانا چاہتے ہیں۔" اس نے اس غیر معمولی تبدیلی کی بات اپنے شوہر سے کہی۔

" کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ اب ایک بھی پیسہ فالتو خرچ نہیں کرتے اور دن رات چٹائیاں بُن کر بیچتے رہتے ہیں۔؟"

" مجھے کیسے معلوم ہو گا۔ ؟" اس کے شوہر نے جواب دیا۔

" بہتر ہو گا کہ تم خود جا کر اپنی پڑوسن سے پوچھ لو۔"

شوبھا یہی بات چارو سے بھی پوچھنا چاہتی تھی مگر اسے موقعہ نہیں ملتا تھا۔ چارو دن رات کام میں مصروف رہتی۔ اب پہلے کی طرح باڑ کے پاس کھڑے ہو کر باتیں کرنے کی اُسے بالکل فرصت نہیں تھی۔

آخر کار جب شوبھا سے ضبط نہ ہو سکا تو وہ اس راز کا پتا لگانے چارو کے گھر جا پہنچی۔ اُس وقت چارو چٹائی بننے میں مصروف تھی۔ شوبھا کو دیکھ کر وہ کھڑی ہو گئی اور ایک چٹائی بچھا کر پھر کام میں لگ گئی۔ شوبھا سے باتیں کرتے وقت بھی اس کا کام بند نہیں ہوا۔

کچھ دیر تک دونوں یونہی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں۔ کبھی اپنے دوستوں کی، کبھی رشتے داروں کی اور کبھی گاؤں کی زندگی کی۔

پھر باتوں ہی باتوں میں شوبھا نے چپکے سے اپنا وہ سوال پوچھ ہی لیا جو اُسے اتنے دنوں سے پریشان کیے ہوئے تھا۔

" یہ سب کیا ہو رہا ہے چارو؟ کیا دامو کو آج کل کام کی تنگی ہو رہی ہے؟ "

" نہیں رے۔ " چارو نے جواب دیا۔ " بھگوان کی کرپا سے انھیں کافی کام مل جاتا ہے۔ "

" لیکن، میں تو دیکھ رہی ہوں کہ اب کوئی بھی چیز پہلے جیسی نہیں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے آج کل مچھلی اور گوشت پکانا کیوں بند کر دیا ہے۔ گانا بجانا بھی چھوٹ گیا ہے۔ دن بھر چٹائیاں بنتی رہتی ہو اور نہ جانے کیوں اتنی پریشان دکھائی دیتی ہو؟"

"کوئی خاص بات نہیں ہے۔" چارو نے جواب دیا۔
"بس یوں سمجھ لو کہ اب ہمارے رہنے کا ڈھنگ بدل گیا ہے۔"
"نہیں ۔" شوبھا نے کہا۔ "کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہے۔ ویسے اگر تم مجھے بتانا نہیں چاہتیں تو تمہاری مرضی۔ میں تو تمہاری مدد کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے پوچھ بھی رہی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ شاید تمہیں روپے پیسوں کی ضرورت ہو۔ اگر ایسا ہے تو بتاؤ۔ میں اپنے پتی سے کہوں گی۔"
"ارے نہیں۔" چارو نے فوراً جواب دیا مگر دل ہی دل میں اُسے شوبھا کی یہ بات بُری لگی۔ اس نے آگے کہا۔
"ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہے۔ تم چاہتی ہو تو میں تمہیں اصل بات بتائے دیتی ہوں۔ لیکن، کسی سے کہنا نہیں۔ کہیں میرے پتی کو پتا چل گیا تو وہ مجھ پر بہت ناراض ہوں گے۔"
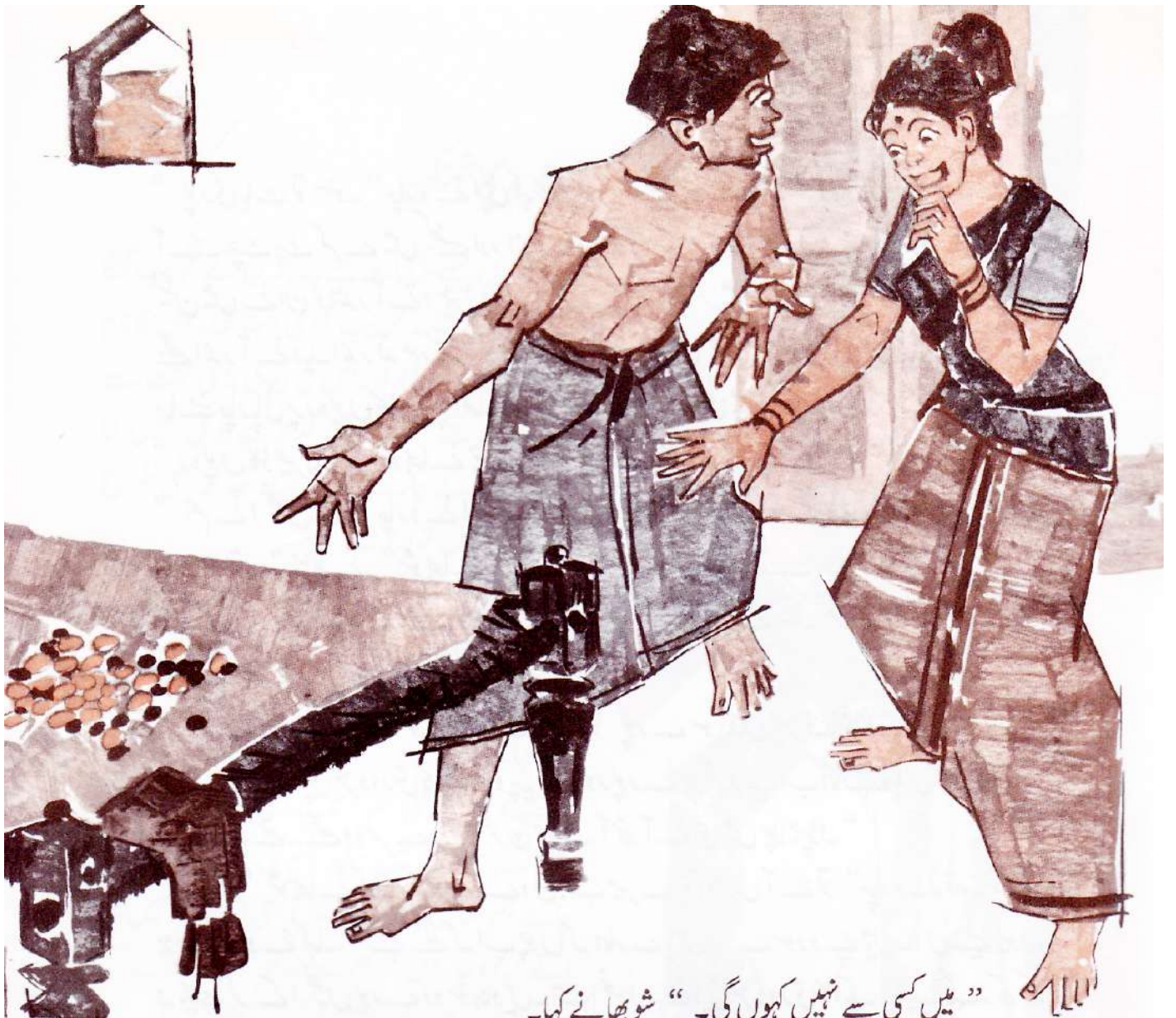
"میں کسی سے نہیں کہوں گی۔" شوبھا نے کہا۔

"تم تو مجھے جانتی ہی ہو۔ مجھے بتایا ہوا بھید ایسا ہے جیسے کنوئیں میں پھینکا ہوا کنکر۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔"

"اچھی بات ہے تو سنو۔" چارو نے آگے کہا۔ "دو تین ہفتے پہلے کی بات ہے۔ میرے پتی کام سے لوٹ رہے تھے ان کے پاس اپنی کمائی کا ڈیڑھ روپیہ تھا۔ لیکن، جیسے ہی وہ اپنے گھر کے دروازے کے پاس پہنچے تو انھیں سیڑھی پر ایک چھوٹی، سفید تھیلی پڑی دکھائی دی۔ انھوں نے تھیلی اُٹھالی۔ تھیلی بھری تھی اور اس کے اندر چھن چھناہٹ ہو رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے اندر روپے ہیں۔"

"کیسی عجیب بات ہے۔ ؟" شوبھا نے کہا۔ "روپوں کی تھیلی۔"

" پوری بات تو سنو۔ " چارو نے اپنی کہانی جاری رکھتے ہوئے کہا۔ " وہ تھیلی اٹھا کر اندر لے آئے۔ چٹ پٹ کمرے میں گھسے اور اندر سے کنڈی بند کرلی۔ اس وقت میں رسوئی میں تھی۔ لیکن میں نے ان کو اندر آتے دیکھ لیا تھا۔ کمرے کے پاس جا کر میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ انھوں نے مجھے اندر آنے دیا۔ اندر قدم رکھتے ہی میں سمجھ گئی کہ ان کی عجیب حرکتوں کی وجہ کیا ہے۔ میرے سامنے چارپائی پر روپوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ وہ سبھی روپے سفید تھیلی میں تھے۔ "

" روپوں کا ڈھیر۔ ! " شوبھا نے حیران ہو کر پوچھا۔ " کتنے روپے تھے۔ ؟ "

" ہم نے انھیں گنا۔ " چارو نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ " گن کر دیکھا تو کل ننّانوے روپے تھے۔ " ننّانوے۔ " شوبھا نے پوچھا۔ "سو میں ایک ہی کم۔ پورے سو ہونے چاہیے تھے۔ "

" نہیں۔ صرف ننانوے تھے۔ ہم نے کئی مرتبہ پوری احتیاط سے گنا۔ مگر وہ کل ننّانوے تھے۔ ننّانوے ہی رہے۔ " پھر شوبھا نے پوچھا۔

" ہم نے سوچا۔ کیسے افسوس کی بات ہے۔ ؟ پورے سو نہیں صرف ننانوے ہی ہیں۔ تب میرے پتی نے اپنی مزدوری کا ایک روپیہ نکالا اور پورے سو کر دیے اب ہمارے پاس صرف آٹھ آنے بچے تھے۔ مجھے دوسرے دن کا خرچ صرف آٹھ آنے ہی میں چلانا پڑا۔ "

" اوہ ! " شوبھا نے کہا۔ " دوسرے دن جب میرے پتی واپس آئے تو " چارو نے قصّہ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ " کہنے لگے کہ اب چوں کہ ہمارے پاس پورے سو روپے ہیں۔ اس لیے کیوں نہ بچت کر کے انھیں پورے دو سو بنا دیں۔ تب انھوں نے اپنی مزدوری کا ایک روپیہ الگ رکھ کر مجھے باقی آٹھ آنے دے دیے۔ تب سے آج تک یہی سلسلہ چلا آ رہا ہے۔ "

" اوہ ! میں سمجھ گئی۔ " شوبھا نے کہا۔ " کہ اب تمہارے گھر مانس مچھلی کیوں نہیں بنتی۔ تمہارے گیت کیوں بند ہو گئے ہیں اور تم ہر وقت اتنی پریشان کیوں دکھائی دیتی ہو۔ ؟ میں یہ بھی سمجھ گئی کہ تم دن رات چٹائیاں کیوں بنتی رہتی ہو۔ یہ ننّانوے کے پھیر کا ہی جادو ہے جس نے سب کچھ بدل دیا ہے۔ "

جادو کا شنکھ

بہت دنوں پہلے کی بات ہے۔ بنارس کے قریب گنگا کے کنارے ایک غریب آدمی رہتا تھا۔ اس کا نام رام بابو تھا۔ رام بابو اور اس کی بیوی بڑی محنت سے کام کرتے تھے مگر پھر بھی گذارے لائق نہیں کما پاتے تھے۔ بے چارے آدھا پیٹ کھا کر کسی طرح زندگی کے دن گزار رہے تھے۔

بسنت کے موسم کی بات ہے۔ ایک دن وہ دونوں اپنی جھونپڑی کے پاس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

"ساری دُنیا خوبصورت ہے۔" رام بابو کی بیوی نے کہا۔

"جسے دیکھو سُکھی نظر آتا ہے اکیلے ہم ہی ایسے ہیں جن کے نصیب میں سُکھ نام کی کوئی چیز نہیں۔ چاہے ہم کتنا ہی کیوں نہ کر لیں کبھی اتنا پیسہ نہیں بچا پاتے کہ دو چار دن آرام سے گذار سکیں۔ سنا ہے کہ ہمالیہ پہاڑ پر کچھ ایسے مہان لوگ رہتے ہیں جن کے پاس غریبوں کی مدد کرنے کی شکتی ہوتی ہے۔ کیوں نہ تم ایک بار ہمالیہ کی یاترا پر جاؤ اور ایسے ہی کسی مہان آدمی کی تلاش کرو۔"

"یقین تو کسی کا بھی نہیں۔" اس کی بیوی نے جواب دیا۔

"لیکن اتنا میں ضرور جانتی ہوں کہ ہر بھلے آدمی پر
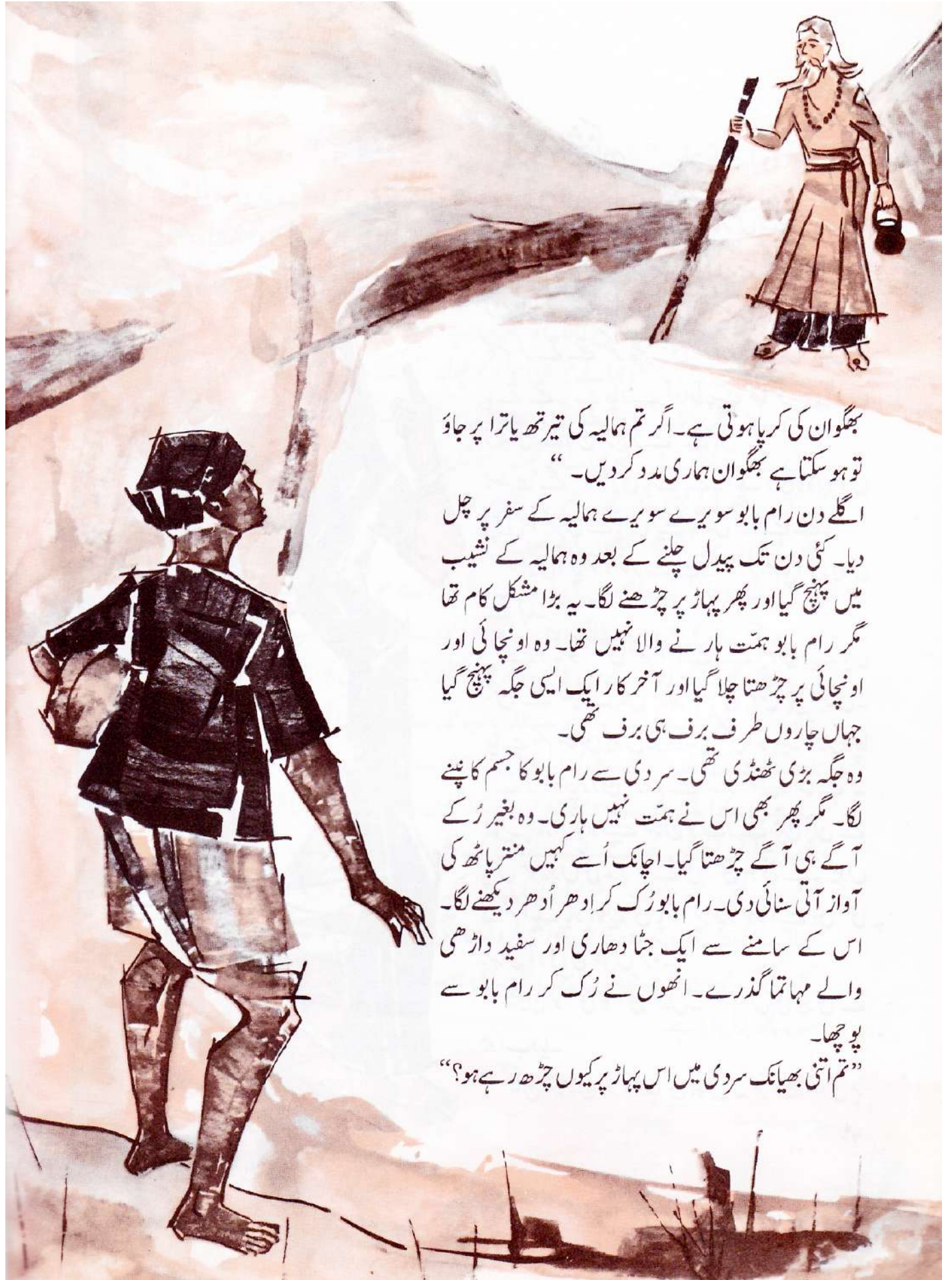
بھگوان کی کرپا ہوتی ہے۔ اگر تم ہمالیہ کی تیرتھ یاترا پر جاؤ تو ہو سکتا ہے بھگوان ہماری مدد کردیں۔"

اگلے دن رام بابو سویرے سویرے ہمالیہ کے سفر پر چل دیا۔ کئی دن تک پیدل چلنے کے بعد وہ ہمالیہ کے نشیب میں پہنچ گیا اور پھر پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ یہ بڑا مشکل کام تھا مگر رام بابو ہمّت ہارنے والا نہیں تھا۔ وہ اونچائی اور اونچائی پر چڑھتا چلا گیا اور آخر کار ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں چاروں طرف برف ہی برف تھی۔

وہ جگہ بڑی ٹھنڈی تھی۔ سردی سے رام بابو کا جسم کانپنے لگا۔ مگر پھر بھی اس نے ہمّت نہیں ہاری۔ وہ بغیر رُکے آگے ہی آگے چڑھتا گیا۔ اچانک اُسے کہیں منتر پاٹھ کی آواز آتی سنائی دی۔ رام بابو رُک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس کے سامنے سے ایک جٹا دھاری اور سفید داڑھی والے مہاتما گذرے۔ انھوں نے رُک کر رام بابو سے پوچھا۔

"تم اتنی بھیانک سردی میں اس پہاڑ پر کیوں چڑھ رہے ہو؟"

بے چارہ رام بابو کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ بس ہاتھ جوڑے ان مہاتما کی طرف دیکھتا رہا۔
" تمہیں کیا چاہیے۔ ؟ " مہاتما جی نے پھر پوچھا۔
" مجھے آپ کی مدد چاہیے۔ " رام بابو نے مشکل سے جواب دیا۔ " میں اور میری بیوی بہت غریب ہیں۔ مہربانی کر کے کچھ ایسا کر دیجیے جس سے ہماری غریبی دور ہو جائے۔ "
" لو۔ یہ شنکھ لے جؤ۔ " مہاتما جی نے کہا۔ " یہ ہر روز تمہیں سونے کا ایک سکّہ دیا کرے گا پھر تم غریب نہیں رہو گے۔ " شنکھ دے کر مہاتما جی پیچھے مُڑے اور پہاڑوں کی چوٹی کی طرف چل دیے۔ رام بابو مہاتما جی کے غائب ہونے تک اسی طرف دیکھتا رہا۔ پھر شنکھ کو ہوشیاری سے پکڑ کر نیچے اترا اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں اُسے ایک بیوپاری کے گھر رات گذارنی پڑی۔ بیوپاری نے اس سے

" تمہیں نے مجھ سے ہمالیہ جانے کو کہا تھا۔ " رام بابو اپنی بیوی سے بولا۔ " اب دیکھو کیا ہوا۔
؟" اس مہاتما جیسے آدمی نے مجھے بیوقوف بنادیا۔ "
اس پر اس کی بیوی نے کہا۔
" ہمیں صبر سے کام لینا چاہیے۔ مجھے لگتا ہے کہ کہیں ضرور راستے میں گڑبڑ ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے
کسی نے تمہارا جادوئی شنکھ چرا کر اس کی جگہ معمولی شنکھ رکھ دیا ہو۔ "
" ایسا ہونا تو کہیں ممکن ہی نہیں۔ " رام بابو نے کہا۔
" میں رات ایک بیوپاری کے گھر رہا اور بڑا نیک اور ایماندار آدمی تھا۔ "
" تم نے اُسے یہ تو نہیں بتادیا تھا کہ یہ ایک جادوئی شنکھ ہے۔ "
اس کی بیوی نے پوچھا۔
" ہاں بتایا تھا۔ سب کچھ بتادیا تھا۔ " رام بابو نے جواب دیا۔ " ہوں۔ ٹھیک ہے۔ " اس کی بیوی
نے کہا۔ " اب تم ایک کام کرو۔ کچھ دن رکنے کے بعد اس بیوپاری کے گھر ایک رات اور بتاؤ۔
ساتھ میں یہ معمولی شنکھ بھی لے جانا۔ بیوپاری تم سے پھر طرح طرح کے سوال پوچھے گا۔ میں

تمھیں بتاتی ہوں کہ تم اس کو کیا جواب دو گے۔ "
اس کے بعد رام بابو کی بیوی نے اسے سب کچھ
سمجھایا جو بیوپاری سے کہنا تھا۔

سات دن بعد رام بابو ایک بار پھر گھر سے نکلا اور
شام ڈھلنے تک بیوپاری کے گھر جا پہنچا۔

" آج پھر کیسے آ گئے۔ ؟ " بیوپاری نے اس
سے پوچھا۔

" کیا بتاؤں۔ ؟ " رام بابو نے کہا۔ "جو شنکھ
مجھے مہاتما جی نے دیا تھا، وہ معمولی شنکھ نکلا۔ اس
سے کوئی سونا ونا نہیں نکلا۔ تب میں پھر مہاتما جی
کے پاس گیا۔ انھوں نے کہا شاید غلطی سے ایسا
ہو گیا ہے۔ مجھے پھر دیکھ کر وہ بہت خوش
ہوئے۔ انھوں نے مجھے ایک اور شنکھ دیا۔ یہ
شنکھ ایک کی بجائے روز دو سونے کے سکّے دیا

سو گیا تو اس نے چپکے سے اس کا شنکھ نکال کر اس کی جگہ پہلے کا چرایا ہوا شنکھ رکھ دیا۔
دوسرے دن رام بابو اپنا شنکھ لے کر گھر کی طرف چل دیا۔ اُس کے جانے کے بعد سوداگر بڑا خوش ہوا۔ اُس نے اپنی بیوی کو نیا شنکھ ملنے کی بات بتائی اور پھر نہادھو کر شنکھ کے سامنے بیٹھ کر پوجا کی۔

" شنکھ ! او شنکھ !! سونے کے دو سکّے نکالو۔ " اس نے کہا۔ مگر شنکھ سے کچھ نہیں نکلا۔ سوداگر نے پھر سکّے نکالنے کے لیے کہا۔ ہاتھ جوڑے، منّت سماجت کی، لیکن شنکھ سے پھوٹی کوڑی بھی نہیں نکلی۔

سوداگر نے اب شنکھ کو اٹھا کر غور سے دیکھا۔ تب جا کر اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ جادوئی شنکھ نہیں ہے، بلکہ اس کا اپنا وہی شنکھ ہے جو اس نے رام بابو کے جادوئی شنکھ کی جگہ چوری سے رکھ دیا تھا۔
رام بابو جب گھر پہنچا تو کافی رات ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی بیوی کو شنکھ دکھایا۔ اس شنکھ سے اگلے دن سویرے سونے کا ایک سکّہ نکلا۔ اس کے بعد روز سویرے شنکھ سے سونے کا ایک سکّہ نکلتا رہا۔
رام بابو کی غریبی دور ہو گئی اور دونوں میاں بیوی آرام سے رہنے لگے۔

نمک کا جہیز

بوڑھا راجپوت سپاہی وجے موت کی آخری گھڑیاں گن رہا تھا۔ اپنی زندگی میں اس نے بہت سی لڑائیوں میں اپنی بہادری کے جوہر دکھائے تھے اور کئی لڑائیاں جیتی تھیں۔ اس کے بیٹے اجے اور اجیت اس کی چارپائی کے پاس کھڑے تھے۔ دونوں بہت اداس تھے۔ وہ اپنے باپ کو دنیا میں سب سے زیادہ چاہتے تھے اور جتنا چاہتے تھے اتنا ہی احترام بھی کرتے تھے۔

اجے توجوان ہوچکا تھا مگر اجیت کا ابھی لڑکپن تھا۔ اس کے باپ نے اجے سے کہا :

" بیٹے !اپنے بھائی کی اچھی طرح سے دیکھ بھال کرنا۔ اُسے بہادر طاقت ور اور بھلا انسان بننے کی تربیت دینا تاکہ آگے چل کر وہ بڑا آدمی بن سکے۔ "

چند دن بعد وجے چل بسا۔ دونوں بیٹے بہت روئے۔ اب گھر کی ساری جائیداد گائے بھینس اور چراگاہوں کی ذمہ داری اجے کے اوپر تھی۔ وہ بڑی محنت اور ذمّے داری سے سارے کام پورے کرتا تھا۔ اس کی بس ایک ہی تمنّا تھی کہ اس کا چھوٹا بھائی بہادر، طاقتور اور نیک آدمی بنے تاکہ آگے چل کر نام کما سکے۔ اجیت کا سارا وقت گھڑسواری، شکار کھیلنے اور تیر اندازی میں گذرتا۔ سارے

علاقے میں اس کے مقابلے کا کوئی تیر انداز نہ تھا۔ اس نے تلوار چلانا بھی سیکھا اور کچھ ہی دنوں میں وہ ایک ماہر تلوار باز بن گیا۔ اب وہ ایک طاقتور، تندرست اور خوبصورت نوجوان بن گیا تھا۔ اس کے تمام دوست احباب اُسے دل سے چاہتے اور اس کی تعریف کرتے نہ تھکتے۔

اجے اپنے چھوٹے بھائی اجیت کو بہت چاہتا تھا۔ اُسے اپنے بھائی پر فخر تھا مگر اجے کی بیوی اجیت کو زیادہ پسند نہیں کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اجیت کو اجے کے ساتھ کھیتی باڑی میں مدد کرنی چاہیے۔ وہ سوچتی سارا کام اس کے پتی کو ہی کیوں کرنا پڑے۔ ؟

ایک دن اجیت لوٹ کر گھر آیا اور بھابھی سے کھانا مانگنے لگا۔ " رسوئی میں جاکر نکال کیوں نہیں لیتے۔ " اس کی بھابھی نے زور سے چلّا کر کہا۔ " تمہارے سارے کام میں ہی کیوں کرتی پھروں۔ ؟ "

اجیت نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ چپ چاپ رسوئی گھر میں گیا اور کھانا نکال کر اکیلے ہی بیٹھ کر کھانے لگا، لیکن پہلا ہی لقمہ منہ میں رکھا کہ منہ کا ذائقہ بگڑ گیا۔ اس دن اس کی بھابھی نے جان بوجھ کر اس کھانے میں نمک نہیں ڈالا تھا۔

" کیوں بھابھی ؟ " اجیت نے پوچھا۔ " کیا وجہ ہے جو آج آپ نے کھانے میں نمک نہیں ڈالا۔ ؟ کتنا بے ذائقہ لگ رہا ہے۔ "

" میں کوئی تمہاری باورچن ہوں۔ ؟ " اس کی بھابھی نے جواب دیا۔ " اگر تمہیں نمک دار اور ذائقے دار کھانا چاہیے تو جاکر سانبھر کی راجکماری سے شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ ؟ "

سانبھر راجستھان کا ایک راج تھا۔ جو اپنی نمک کی جھیل کی وجہ سے مشہور تھا۔

" تو آپ یہ چاہتی ہیں۔ " اجیت نے کہا۔ " اچھی بات ہے میں ایسا ہی کرنے جارہا ہوں۔ قسم کھاتا ہوں کہ سانبھر کی راجکماری سے شادی کرنے کے بعد ہی گھر لوٹوں گا۔ "

اجیت اسی وقت گھوڑے پر سوار ہو کر سانبھر ریاست کی طرف چل دیا۔ دو تین دن کے سفر کے بعد وہ سانبھر جا پہنچا اور پہنچتے ہی راجہ سے ملنے سیدھا راج محل کی طرف چل دیا۔

" مہاراج !" اس نے راجہ سے درخواست کی۔ " میں آپ کے دربار میں نوکری کرنے حاضر ہوا ہوں۔ "

راجہ نے اجیت کی طرف دیکھا۔ اجیت خوبصورت، سڈول اور طاقتور نوجوان تھا۔ راجہ کو ایک ہی

نظر میں وہ پسند آ گیا۔ اجیت کے بات کرنے کا انداز بھی مہذّب اور نرم تھا۔ راجہ نے اُسے اپنا محافظ مقرّر کر دیا اور رہنے کے لیے محل کے قریب ہی ایک مکان بھی دے دیا۔ نوکری پا کر اجیت بہت خوش تھا۔

ایک دن سانبھر کا راجہ بہت سے لوگوں کو ساتھ لے کر شکار کھیلنے نکلا۔ گھوڑے پر سوار ہو کر وہ اتنی تیزی سے چلا کہ سوائے اجیت کے اور کوئی اس کا ساتھ نہ دے سکا۔ راجہ اور اجیت مختلف قسم کے جانوروں کا شکار کرتے ہوئے جنگل میں بہت دور تک نکل گئے۔ اب راجہ بہت تھک گیا تھا۔ وہ ستانے کے لیے ایک پیڑ کے نیچے بیٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اُسے نیند آ گئی۔ جنگل میں ایک سے ایک خطرناک جنگلی جانور تھے، اس لیے اجیت تلوار میان سے نکال کر راجہ کی پہریداری کرنے لگا۔

اچانک سامنے کی جھاڑیوں سے ایک چیتا نکلا۔ راجہ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ ہی رہا تھا کہ چیتے نے اس پر چھلانگ لگا دی مگر اجیت بلا کی پھُرتی سے چیتے پر جھپٹا اور اس سے بھڑ گیا۔ دونوں جان کی بازی لگا کر لڑنے لگے۔ تھوڑی دیر کی بھیانک لڑائی کے بعد اجیت نے چیتے کو مار گرایا، لیکن اس کے مرتے ہی خود بھی بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔

راجہ اجیت اور چیتے کی لڑائی دیکھ رہا تھا۔ اس کی دلیری اور وفاداری دیکھ کر وہ واہ! واہ کر اٹھا مگر جب اس نے اجیت کو زخمی ہو کر بے ہوش ہوتے دیکھا اس کا دل بے چین ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر اجیت کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اپنے ہاتھوں سے اسے ہوا کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں ہی شکاری دل کے کچھ لوگ وہاں آگئے۔ ان کی مدد سے اجیت کو فوراً محل پہنچایا گیا۔ وہاں اُسے ایک خاص کمرے میں رکھا گیا اور اس کے علاج کے لیے راج ویدوں کو بلایا گیا۔

کئی دن تک اجیت کی حالت میں کوئی سدھار نہیں ہوا۔ لوگ یہ سوچنے لگے کہ وہ اب بچے گا نہیں۔ راجہ رانی اُسے بہت چاہنے لگے تھے۔ انھیں اجیت کی بڑی فکر تھی۔ اس کے علاوہ راجکماری کو بھی اس کی اتنی فکر ہونے لگی تھی کیوں کہ اتنے دنوں میں اسے بھی اجیت سے پیار ہو گیا تھا۔

کچھ دن اور بیتے۔ اجیت کی طبیعت کچھ سدھرنے لگی۔ جب لوگوں کو پتا چلا کہ اب اجیت بچ جائے گا تو چاروں طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ کچھ ہی ہفتوں میں وہ چارپائی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور جلد ہی مکمل صحت یاب ہو گیا۔ ایک دن راجہ نے اجیت کو اپنے پاس بلا کر کہا۔

'' اجیت ! مجھے بچانے کے لیے تم نے اپنی زندگی کی بازی لگادی تھی۔ اس کے لیے میں تمہارا کس طرح شکریہ ادا کروں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ''

'' مہاراج ! '' اجیت نے جواب دیا۔ '' میں نے تو اپنا فرض نبھایا ہے۔ میں تو آگے بھی خوشی سے ایسا کرنے کو تیار ہوں۔ ''

اپنے بہادر محافظ کے منھ سے ایسی بات سن کر راجہ بہت خوش ہوا۔ '' تمہیں یہ جتانے کو کہ میں اور رانی تمہیں چاہتے ہیں۔ ہمیں صرف ایک ہی طریقہ نظر آیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم تمہارے ساتھ راجکماری کی شادی کر دیں۔ کیا تمہیں یہ منظور ہوگا۔ ؟ ''

'' مہاراج ! '' اجیت نے کہا۔ '' یہ تو میرے لیے بڑی عزت کی بات ہے۔ آپ کی اس مہربانی کے لیے میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں۔ راجکماری سے شادی کرنا میرے لیے خوش نصیبی کی بات ہوگی۔ ''

جب لوگوں نے سنا کہ راجکماری کی شادی اجیت کے ساتھ ہونے جارہی ہے تو ریاست بھر میں خوشیاں منائی جانے لگیں۔ اور شاہی گھرانے کی اس شادی کی تیاریاں زور شور سے ہونے لگیں۔ راجہ رانی آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگے کہ جہیز میں کیا دیا جائے۔ کتنے ہیرے جواہرات دیے جائیں، کتنا سونا دیا جائے، کتنا کپڑا اور اونٹ گھوڑے دیے جائیں۔ ؟ ''

مگر تبھی اجیت نے راجہ کے پاس جاکر ایک انوکھی درخواست کی۔

'' مہاراج '' اس نے کہا۔ '' مجھے یہ سونا چاندی اور جواہرات کچھ نہیں چاہیے۔ جہیز میں صرف ایک چیز چاہتا ہوں۔ ''

'' کیا چیز چاہتے ہو۔ ؟ '' راجہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

'' اگر آپ مجھے سانبھر نمک سے لدے سو اونٹ جہیز میں دیں تو میں آپ کا بڑا ہی شکر گزار ہوں گا۔ اس عجیب فرمائش پر راجہ اور رانی دونوں ہی حیران رہ گئے مگر جب اجیت نے نمک کو ہی جہیز میں دینے پر زور دیا تو وہ مان گئے۔

شادی ہونے کے بعد اجیت اور راجکماری نے راجہ اور رانی کو سلام کیا اور وداع ہو کر اپنے گھر چل دیے۔ ان کے پیچھے سانبھر نمک سے لدے سو اونٹ چلے آرہے تھے۔ اس سے پہلے ایسا عجیب جہیز کسی دولہا نے نہیں مانگا تھا۔

اجیت کو گھر چھوڑے کئی سال گذر گئے تھے۔ جیسے ہی اجے کو پتا چلا کہ اس کا چھوٹا بھائی گھر واپس

آرہاہے تو وہ فوراً اس سے ملنے کے لیے دوڑا دوڑا پہنچا۔ دونوں بھائی گلے ملے تو مارے خوشی کے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کے بعد اجیت اپنی دلہن کو لے کر اپنی بھابھی کے پاس آیا۔ بھابھی کے پیر چھو کر اس نے کہا۔ "یہ میری بیوی ہے سانبھر کی راجکماری یہ گھر کے سارے کام کاج میں آپ کی مدد کرے گی۔ اس کے علاوہ جہیز کے طور پر مجھے اتنا نمک ملا ہے کہ زندگی بھر ختم نہیں ہوگا۔"

یہ سن کر اجیت کی بھابھی رونے لگی۔ اُسے اپنی اس بات کا بہت افسوس تھا جو اس نے کئی سال پہلے کہی تھی۔ اس نے بڑے ہی جوش اور پیار سے راجکماری کا استقبال کیا۔ اُسے اس بات کی خوشی تھی کہ جو کچھ بھی ہوا اس کا انجام اچھا ہوا۔